نام کتاب	:	فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟
خطبات	:	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری
ترتیب و تدوین	:	جاوید القادری، ضیاء اللہ نیر
پروف ریڈنگ، اشاریہ	:	عبدالجبار قمر
کمپوزنگ	:	محمد یامین
اشاعت اول	:	جنوری 1985ء 1000
اشاعت دوم	:	فروری 1987ء 3000
اشاعت سوم	:	جنوری 1988ء 3000
اشاعت چہارم	:	نومبر 1994ء 2000
اشاعت پنجم	:	جون 1995ء 2000
اشاعت ششم	:	فروری 2001ء 1100
نگران طباعت	:	محمد جاوید کھٹانہ
مطبع	:	منہاج القرآن پرنٹرز
قیمت	:	روپے

نوٹ: پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تمام تصانیف اور خطبات و لیکچرز کے ریکارڈ شدہ آڈیو/ ویڈیو کیسٹس اور CDs سے حاصل ہونے والی جملہ آمدنی ان کی طرف سے ہمیشہ کے لئے تحریک منہاج القرآن کے لئے وقف ہے۔

(ڈائریکٹر پریس اینڈ پبلیکیشنز)

فرقہ پرستی کا خاتمہ کیونکر ممکن ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

فہرست

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جسدِ ملت میں فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کا زہر اس حد تک سرایت کر چکا ہے کہ نہ صرف اس کے خطرناک مضمرات کا کما حقہ احساس وادراک ہر شخص کے لئے ضروری ہے، بلکہ اس کے تدارک اور ازالے کے لئے موثر منصوبہ بندی کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ہمارے گردو پیش تیزی سے جو حالات رونما ہو رہے ہیں، انکی نزاکت اور سنگینی اس امر کی متقاضی ہے کہ ہم نوشتہ دیوار پڑھیں اور اپنے درمیان سے نفرت، بغض نفاق، تشتّت اور انتشار وافتراق کا قلع قمع کر کے باہمی محبت ومودّت، اخوت ویگانگت، یک جہتی اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دینے کی ہر ممکن سعی کریں کہ اسی میں ہماری بقاء اور فلاح ونجات مضمر ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں اہل اسلام میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کا تفصیلاً جائزہ لیا گیاہے۔ اور قرآن وسنت کی روشنی میں اس کے انسداد کیلئے ایک قابل عمل حل (Workable Solution) امت مسلمہ کے سامنے رکھا گیا ہے۔آج کی معروضی صورت حال میں یہ موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے بجا طور اس بات کا مستحق ہے کہ تمام مسالک اور مکاتب فکر کے درد دل رکھنے والے حضرات اس کے مندرجات کا سنجیدگی اور غور وفکر کے ساتھ مطالعہ کریں اور قرآن وسنت کی روشنی میں فرقہ پرستی کے منفی رجحانات کے خلاف منظّم تحریک بلکہ جہاد کا آغاز کریں۔

اسلامی معاشرے کے قیام کی انفرادی اور اجتماعی ذمہ داری

قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے:

يَاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَO وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ كُنۡتُمۡ اَعۡدَآءً فَاَلَّفَ بَيۡنَ قُلُوۡبِكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ بِنِعۡمَتِهٖۤ اِخۡوَانًا۔

(آل عمران، ۳:۱۰۲۔۱۰۳)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرا کرو جیسے اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہاری موت صرف اسی حال پر آئے کہ تم مسلمان ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

ان آیات بینات میں باری تعالیٰ تمام مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ تقوی اختیار کریں، یعنی اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈریں جس طرح ڈرنے کا حق ہے۔ یہ عمومی حکم تمام اہل اسلام کے لئے ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی لمحہ خوف اور خشیت خداوندی سے خالی نہ ہو اور جب زندگی کا سفر تمام ہو اور موت کی ساعت آ پہنچے تو وہ بھی حالتِ اسلام میں ہی آئے۔ اس کے بعد انکو اللہ کی رسی یعنی دین حق کو مضبوطی سے تھام کر باہمی اتحاد و اتفاق کی تلقین اور تفرقہ و انتشار سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ آخر میں اس احسان کا ذکر کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ نے انہیں آگ کے گڑھے کے کنارے یعنی یقینی تباہی سے بچایا۔ اور نفرت و کدورت کی جگہ ان کے دل میں باہمی محبت و مودت ڈال دی۔

ان ارشاداتِ ربانی کی رو سے مسلمانوں پر ایک فعال اسلامی معاشرے کے قیام کے لئے دو قسم کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔

انفرادی ذمہ داری

اسلامی معاشرے کی کامیابی کی شرط اولین یہ بیان کی گئی ہے کہ انفرادی حیثیت سے ہر فرد اپنی اپنی جگہ اپنی ذمہ داری مقدور بھر ادا کرے۔ اس بارے میں ارشاد ربانی ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرہ، ٢:٢٨٦) اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

اس آیت کریمہ میں جہاں انسانوں پر استطاعت سے بڑھ کر ذمہ داری کا بوجھ نہ ڈالنے کا ذکر ہے، وہاں یہ بھی بالواسطہ مذکور ہے کہ ہر کسی کو اپنی اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق انفرادی طور پر اپنی ذمہ داری نبھانی چاہیے۔ ورنہ اس کا خدا کے ہاں مواخذہ ہوگا۔

مسلم معاشرے کے تمام افراد کا اپنے اندر انفرادی ذمہ داری کے احساس کا اجاگر کر لینا کامیابی وکامرانی کی خشتِ اول ہے کیونکہ اصلاح احوال کی جانب پہلا قدم ہی تقوی کو پوری زندگی میں جاری وساری کرنا قرار دیا گیا ہے تقوی کیا ہے؟ امام راغب اصفہانی المفردات میں فرماتے ہیں:

التقوى حفظ الشی مما يؤذيه و يضره۔ (المفردات، ٨٨١) تقوی سے مراد ہر اس چیز سے محفوظ رہنا ہے، جو تکلیف اور نقصان پہنچائے۔

تقوی کی تعریف ایک اور مقام پر ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے:

التقوى حفظ النفس عمايؤثم۔ (المفردات:٨٨١) تقوی سے مراد ہر اس شے سے بچنا ہے جو گناہ میں مبتلا کر دے۔

آیت مذکورہ میں ”وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ“ کہہ کر انتہائی اہم نکتہ سمجھا دیا

گیا ہے کہ جینا اور مرنا سب کچھ اللہ کے لیے ہو۔ زندگی بھی اسلام کی نذر رہو اور موت بھی۔ گویا انفرادی ذمہ داری کا معنی یہ ہے کہ بجائے دوسروں کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کے ہر انسان اصلاحِ احوال کا آغاز خود اپنی ذات سے کرے۔ وہ جہاں کہیں بھی جس حیثیت سے ہے سب سے پہلے اپنی اخلاقی ذمہ داری نبھائے۔ دوسروں سے اصلاح کی توقع کر کے نہ بیٹھا رہے۔ اس وقت ہماری خرابی یہ ہے کہ ہم اپنی انفرادی ذمہ داری عملاً نبھانے کی بجائے دوسروں کو موردِ تنقید بناتے رہتے ہیں اور اس طرح کہیں سے بھی اصلاح کا آغاز نہیں ہو پاتا۔

اجتماعی ذمہ داری

اسلامی معاشرے کو صحیح خطوط پر منظّم کرنے کی ذمہ داری من حیث المجموع تمام امت مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی بعثت مبارکہ زمانی و مکانی حدود سے ماوراء قیامت تک تمام نسلِ انسانی کے لئے ہے۔ اس لئے اجتماعیت کا تصور اسلام کی فطرت کا جزو لاینفک ہے۔ اجتماعیت جسدِ اسلام کے رگ و ریشہ میں اس طرح سمائی ہوئی ہے کہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، ہر جگہ اس کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے۔ کیونکہ شجر اسلام کے برگ و بار کو زمانے کی بلا خیزیوں سے محفوظ کرنے کے لئے قرآن حکیم کی تعلیمات اور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ ہی مشعلِ راہ ہیں۔ اس لئے فرقہ پرستی کے بلا خیز طوفانوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے بھی جس ضابطہ عمل کو اپنانے کی ضرورت ہے وہ قرآن و سنت کے تصورِ اجتماعیت پر مبنی ہونا چاہیے۔

فلسفہ اعتصام اور تصورِ وحدت

ارشاد ربانی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ (آل عمران ۳:۱۰۳)	’’اور تم سب ملکر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ مت ڈالو‘‘

محولہ بالا آیت دو حصوں پر مشتمل ہے۔ جس کا پہلا حصہ امر اور دوسرا نہی پر مبنی ہے۔ اس کے ذریعے بیک وقت مثبت اور منفی دونوں اعتبار سے واضح احکام صادر فرمائے گئے ہیں۔ قرآن و سنت کے بیشتر احکام امر کی نوعیت کے ہوتے ہیں یا نہی کی نوعیت کے۔ جنہیں آج کی جدید قانونی اصطلاحات میں بالترتیب Acts of Commission اور Acts of Ommission کہا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا آیت کریمہ قرآن کے ان مقامات میں سے ہے، جہاں مثبت اور منفی دونوں احکام کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جُملہ اہلِ ایمان سے خطاب فرما رہے ہیں کہ تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو، یہ تو تھا مثبت حکم۔ اس کے بعد امتناعی حکم آتا ہے کہ خبردار! تم باہمی تفرقہ اور انتشار کا شکار نہ ہونا۔ اس میں واضح اور غیر مبہم طور پر فرقہ پرستی اور تفرقہ پروری کی مذمت کی گئی ہے گویا یہ آیت اخوت و اتحاد کی دعوت اور تفرقہ و انتشار کی مذمت، دونوں پہلوؤں کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ یہاں بڑی وضاحت سے امتِ واحدہ کے تصور کو اذہان و قلوب میں جاگزیں کیا گیا ہے کہ ظہور اسلام کا بنیادی مقصد نسل و رنگ اور شعوب و قبائل پر مبنی عصبیت و تفاخر کے بتوں کو توڑ کر تمام نوع انسانی کو ایک مرکز پر لانا اور ایک دائمی وحدت کے رشتے میں منسلک کرنا ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت اور حیات طیبہ بھی اسی مقصد کی غمازّ اور آئینہ دار رہے، جو قرآن حکیم کا منشاءِ نزول ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگراند

سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا:

مثل المؤمنین فی توادھم و تراحمھم و تعاطفھم، مثل الجسد اذا اشتکی منه عضو، تداعی له	مسلمانوں کی باہمی محبت اور رحمت و مودت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک ہی جسم ہو، جس میں ایک عضو کو تکلیف پہنچے تو سارا

سائر الجسد بالسهر والحمى۔ جسم بے خواب و بے آرام ہو جاتا ہے۔

(صحیح المسلم، ۲:۳۲۱، کتاب البر والصلۃ والاداب، باب تراحم المومنین و تعاطفھم واتعاضدھم، رقم حدیث:۲۵۸۶)

جس طرح ایک جسم کے مختلف اعضاء اپنی جداگانہ حیثیت اور انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے درپے آزار نہیں ہوتے، بلکہ پورے جسم کے لئے تقویت کا باعث بنتے ہیں۔ بعینہ حضور نبی کریم ﷺ کے ارشاد کے مطابق تمام امت مسلمہ ایک جسم کے ہے اور اس کے افراد بمنزلہ اعضاء۔ جسم کا ایک عضو بھی تکلیف اور درد میں مبتلا ہو تو بقیہ سارے اعضاء چین اور آرام سے نہیں رہ سکتے۔ درد بے شک جسم کے کسی ایک حصے میں ہو، اس کے لئے آنکھ اشکبار ہوتی ہے۔ یہی رشتہ ایک مسلمان فرد کا ملت اسلامیہ سے ہونا چاہیے۔ جو آنکھ کا پورے جسم سے ہوتا ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

دیکھا جائے تو یہی اجتماعی درد کا وہ لازوال رشتہ ہے، جو ملت اسلامیہ کے افراد کی کثرت کو ایک وحدت میں بدل دیتا ہے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم میر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

جیسے جسم کا کوئی ایک حصہ دوسرے سے برسرپیکار نہیں ہو سکتا، بلکہ تمام اعضاء جسم کو بیرونی خطرات سے بچانے کے لئے ہمہ وقت متحد اور مستعد رہتے ہیں۔ بلکہ ہر ایک کی حفاظت کی ضمانت دوسرے عضو کی حفاظت میں مضمر ہوتی ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے مختلف فرقے اور طبقے جو جسمِ ملت کے مختلف اعضاء ہیں، ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو کر نہ صرف ملت کی اجتماعی سلامتی

اور تحفظ کو معرضِ خطر میں ڈال رہے ہیں بلکہ اپنے انفرادی تحفظات کو بھی تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ مختلف طبقوں اور فرقوں کی مثال ندی نالوں کی سی ہے جو ایک ہی دریا سے فیضیاب ہو رہے ہیں' دریا کی روانی سے ہی ان کا بہاؤ جاری ہے۔ اگر دریا ہی خشک ہو گیا تو ان کا اپنا وجود کب برقرار رہے گا۔

تفرقہ پروری کی موت کفر کی موت ہے

اجتماعیت کو چھوڑ کر جدا جدا اکائیوں میں منقسم ہو جانا اور اپنے اپنے تشخصات میں گم ہو جانا تشتت اور انتشار کو جنم دیتا ہے' جس سے ملت کی اجتماعی قوت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ بالآخر فرقہ بندی اور تفرقہ پروری کی یہی زندگی ایسی موت کی طرف لے جاتی ہے جو قرآن کی اصطلاح میں کفر کی موت ہے۔ اسی فلسفے کی وضاحت حضور علیہ السلام نے یوں فرمائی ہے:

يَدُاللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ ' وَ مَنْ شَذَّ شَذَّ اِلَى النَّارِ۔	اجتماعی وحدت کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے جو کوئی اس سے جدا ہوگا دوزخ میں جا گرے گا۔
(جامع الترمذی' ۲: ۳۹' کتاب الفتن' باب ماجاء فی لزوم الجماعۃ' رقم حدیث: ۲۱۶۷)	

فرقہ بندی زیاں کاری ہے

آج شومئی قسمت سے حالت یہ ہو گی ہے کہ ملت اسلامیہ مختلف طبقوں اور فرقوں میں منقسم ہو کر اپنے اپنے مسلک کے تحفظ کو اسلام کی سلامتی اور استحکام کا ضامن گردان رہی ہے۔ ہر مسلک کے پیرو کار اس حقیقت سے کلی طور پر اِغماض برت رہے ہیں کہ اگر خدانخواستہ دشمن کے ہاتھ اسلام کے دامن تک پہنچ گئے اور خاکم بدہن محمد عربی ﷺ کی ملت کو اجتماعی طور پر کوئی گزند پہنچ گیا تو تمہارے مسلکوں اور فرقوں کو کون سلامتی کی ضمانت دے گا؟ قرآن حکیم کا فلسفہ اعتصام ہمیں

جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر اس امر کی طرف متوجہ کر رہا ہے کہ باہمی انتشار و تفرقہ سے احتراز کر کے از سرِ نو اپنی شیرازہ بندی کی تدبیر کریں کہ یہی عافیت اور سلامتی کا راستہ ہے۔ قرآن نے باہمی جدل و پیکار کو یہودیت کا تصورِ حیات قرار دیا ہے۔ تاریخ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ جن اسباب کی بناء پر یہودیوں پر ادبار و انحطاط اور عالمگیر تباہی کے سائے مسلط کر دیئے گئے تھے۔ اگر وہی اسباب امت مسلمہ میں مجتمع ہو گئے تو پھر یہ بات یقینی سمجھ لیجئے کہ ویسی ہی بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر تباہی تمہارا مقدر بن سکتی ہے۔ یہ کوئی زبانی نظریہ نہیں بلکہ قرآنی اعلان اور تاریخی مشاہدے کی بات ہے کہ باہمی اختلاف و نزاع اور تفرقہ پروری کے نتیجے میں قوموں کا وقار مجروح اور رعب و دبدبہ ختم ہو جاتا ہے اور دشمنوں کی نظر میں ان کی حیثیت بالکل گر جاتی ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَ تَذْهَبَ رِيْحُكُمْ۔ (الانفال، ۸:۴۶)	اور آپس میں جھگڑا مت کرو ورنہ (متفرق اور کمزور ہو کر) بزدل ہو جاؤ گے اور (دشمنوں کے سامنے) تمہاری ہوا (یعنی قوت) اکھڑ جائے گی۔

اس قرآنی اعلان کی تائید ہمیں زوال خلافت بغداد کی تاریخ سے مکمل طور پر میسر آتی ہے۔

زوالِ خلافتِ بغداد......ایک تاریخی جائزہ

فرقہ پرستی کی تنگناؤں میں بھٹکنے والے ناعاقبت اندیش مسلمان کے لئے زوالِ بغداد کی تاریخ عبرتناک منظر پیش کر رہی ہے اور زبان حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے

۶۵۶ ہجری کا دور تھا۔ خلافت عباسیہ اپنے آخری سانس پورے کر رہی تھی۔ خلیفہ وقت مستعصم باللہ کا وزیر اعظم ابن علقمی شیعہ مسلک رکھتا تھا۔ فرقہ پرستی کا بازار گرم تھا اور مسلکوں کی باہمی کشمکش اور آویزش اپنے عروج پر تھی۔ بغداد کے گلی کوچے مناظروں اور بحث و تکرار کا مرکز بن چکے تھے۔ وزیر اعظم کی سیاست شیعہ مسلک کے گرد گھومتی تھی۔ جب کہ خلیفہ کا بیٹا ابوبکر سنی عقائد کا نقیب تھا۔ دونوں فرقے باہم دست و گریباں تھے اور سارا بغداد تفرقے کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس اندرونی خلفشار سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ منگولوں اور تاتاریوں کا فتنہ اسلامی خلافت کی سرحدوں پر منڈلانے لگا۔ ہلاکو کے طوفانی دستے اس صورت حال میں فائدہ اٹھاتے ہوئے سیلاب کی طرح بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے بغداد کی عظیم سلطنت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گئے۔ تاتاریوں نے عظیم الشان اسلامی تہذیب و تمدن کی روشن شمعوں کو آن واحد میں گل کر دیا۔ ظلم و بربریت کے وہ پہاڑ توڑے کہ ایک اندازے کے مطابق بیس بائیس لاکھ افراد تہہ تیغ کر دیئے گئے اور دریائے دجلہ کا پانی تین دن تک ان کے خون سے سرخ رہا۔ بعض تاریخی روایات کے مطابق تاتاریوں کو بغداد پر حملے کی دعوت بھی کچھ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے ہی اپنے فرقہ وارانہ تعصب کی آگ بجھانے کی خاطر دی تھی، ورنہ خلافت بغداد کا دبدبہ باوجود سیاسی کمزوریوں کے چاردانگِ عالم پر چھایا ہوا تھا اور کسی کو اسلام کے اس مرکز پر حملہ کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس رستاخیز بربریت کے عالم میں شیعہ اور سنی دونوں یکساں طور پر تاتاریوں کی چیرہ دستیوں کا نشانہ بنے اور ان کی عبادت گاہیں، مسجدیں، محراب و منبر اور علمی مراکز تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ تاریخ کی زبان صرف زوالِ بغداد کے حوالے سے ہی نہیں، بلکہ دوسرے حوالوں سے بھی ہمکلام ہو رہی ہے کہ جب بھی دشمن کو اہل اسلام پر غلبہ حاصل ہوا اس کا ہدف کوئی خاص مسلک نہ تھا بلکہ بلا امتیاز سب مسلمان تھے۔ افغانستان میں روس کی فوج کشی ہو یا فلسطین و لبنان میں جنگ باز اسرائیل کی خون آشامی، دونوں کا نشانہ مسلمان ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی فرقہ یا

مسلک سے تعلق رکھتے ہوں۔ اگر خدانخواستہ سرزمین پاک پر دشمن کے قدم پہنچ گئے اور وہ اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو گیا تو ہمارا بھی حشر دوسروں سے مختلف نہ ہوگا۔ پھر جو تباہی ہوگی' اس میں نہ کوئی بریلوی بچ سکے گا نہ دیوبندی' نہ کوئی اہلحدیث اور نہ کوئی شیعہ۔

امتِ مصطفوی کے لئے موثر بنائے اتحاد کیا ہے؟

مسلمان اپنے تشخصات کے باوصف اگر ایک مرکز پر باہم متحد ہونا چاہیں تو ان کے اشتراک کی بنیاد صرف اور صرف حضور رسالتمآب ﷺ کی غیر مشروط غلامی و محبت' مخلصانہ اطاعت و وفاداری اور آپ ﷺ کی سنت و سیرت کی مکمل پیروی اور اتباع ہے۔ محض عقیدہ توحید کی بنیاد پر مسلمانوں کا اتحاد ممکن نہیں کیونکہ خدا کے پرستار تو یہودی اور دیگر الہامی مذاہب کے پیروکار بھی ہیں۔ عقیدہ توحید کے دعویدار وہ بھی ہیں' مگر وہ نسبت جو ہمیں اور ان کو دو الگ امتوں میں تقسیم کر رہی ہے۔ صرف نسبت نبوی ﷺ ہے اور یہی حقیقی توحید کا عملی تشخص ہے ہم صرف امت مصطفوی کے حوالے سے عیسائیوں اور یہودیوں سے ممیّز ہیں۔ صرف یہی وہ بنائے محکم ہے' جس پر شرق و غرب کے مسلمانوں کو باہم متحد اور منظّم کیا جا سکتا ہے' ارشاد نبوی بھی اس بات کی تصریح کر رہا ہے:

فمن اطاع محمدا فقد اطاع اللّٰه' ومن عصی محمدا فقد عصی الله ومحمد فرق بین الناس۔

(صحیح البخاری' ۲:۱۰۸۱' کتاب الاعتصام' باب: الاقتداء بسنن رسول اللہ' رقم حدیث: ۶۸۵۲)

جس نے محمد ﷺ کی اطاعت کی' پس اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد ﷺ کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور محمد ﷺ لوگوں (کافر و مومن) کے درمیان وجہ امتیاز ہیں۔

تفرقہ بازوں کے ساتھ انقطاعِ تعلق کا حکم

قرآن مجید میں حضور نبی کریم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا جا رہا ہے:

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَہُمۡ وَ کَانُوۡا شِیَعًا لَّسۡتَ مِنۡہُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ (الانعام،۶:۱۵۹)

بے شک جن لوگوں نے (جدا جدا راہیں نکال کر) اپنے دین کو پارہ پارہ کر دیا اور وہ (مختلف) فرقوں میں بٹ گئے آپ کسی چیز میں انکے (تعلق دار اور ذمہ دار) نہیں ہیں۔

اس آیت کریمہ میں رسول اکرم ﷺ کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ آپ ایسے لوگوں سے کوئی سروکار اور تعلق نہ رکھیں، جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی جمعیت کا شیرازہ منتشر کر ڈالا۔ اس سے بڑھ کر فرقہ پرستی کی مذمت اور کیا ہوگی۔ فریقین کے درمیان تعلق کا ٹوٹنا کبھی ایک فریق کی جانب سے ہوتا ہے اور کبھی دوسری جانب سے۔ اساطیر قرآنی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اکثر ایسا ہوا کہ پہلی امتوں کے لوگوں نے اپنی بداعمالیوں کی بنا پر خود اپنے نبی سے اپنا تعلق منقطع کر لیا اور وہ فسق و فجور اور کفر و طغیان کے اندھیروں میں بھٹک گئے۔ لیکن یہ بدبختی کی انتہا ہے کہ امت کے لوگ اخلاقی بے راہروی میں اس حد تک ملوث ہو جائیں اور دین کی اصل تعلیم سے اس طرح ہٹ جائیں کہ ان کا نبی حکم خداوندی سے خود ان امتیوں سے قطع تعلق کر لے۔ یہ اتنی بڑی حرمان نصیبی ہے کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ذرا غور کیجئے! فرقہ پرستی کو قرآن نے کیسی بدبختی سے تعبیر کیا ہے۔ دینی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور باہمی نفرت و انتشار کو ہوا دینا اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کی پاداش میں نبی خود ایسے امتیوں سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ گویا امت کا تعلق اپنے نبی کے دامن سے اسی وقت برقرار رہ سکتا ہے،

جب تک امتی اپنے آپ کو ایک وحدت کی لڑی میں منسلک رکھیں۔

تفرقہ پروری نگاہِ نبوت میں

ملی شیرازہ کو تفرقہ و انتشار کے ذریعے تباہ کرنے والوں کے لئے نبی اکرم ﷺ نے انتہائی سخت احکامات صادر فرمائے ہیں۔ مسلم شریف کی روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا:

من اتاکم و امرکم جمیع' علی رجل واحد' یریدان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ۔	جو شخص بھی تمہاری جماعت کی وحدت اور شیرازہ بندی کو منتشر کرنے کے لئے قدم اٹھائے اس کا سر قلم کردو۔

(صحیح المسلم، ۳۳۔ کتاب الامارۃ، ۱۴۔ باب حکم من فرق امر المسلمین وھو مجتمع، رقم حدیث: ۶۵)

ملی شیرازہ بندی کو نقصان پہنچانے والوں کا جہاں آنحضور ﷺ نے سر قلم کر دیئے جانے کا حکم دیا ہے، وہیں ان کی پہچان اور اندازِ فکر و عمل کو بھی شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے، تاکہ ہر دور میں فتنہ پرور اور انتشار پسند عناصر کی پہچان ہوتی رہے۔

ان حذیفة بن الیمانؓ قال قال رسول اللهﷺ ان مما اتخوف علیکم رجل قراء القرآن حتی اذا رتب بھجته علیه وکان اداؤہ الاسلام اعتراہ الی ماشاء الله انسلخ منه و نبذہ وراء ظھرہ وخرج علی جارہ بالسیف و رماہ	حضرت حذیفہؓ بن یمان فرماتے ہیں۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ تمہارے بارے میں مجھے جن امور کا اندیشہ ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک ایسا آدمی (عالم) ہوگا جو قرآن بہت پڑھے گا۔ حتی کہ وہ قرآن کی رونق سے پورے طور پر سیراب ہوگا۔ اس کا اوڑھنا بچھونا بھی اسلام ہوگا۔

بالشرک قال قلت یارسول اللّٰہ ایھما اولی بالشرک المرمی اوالرٰمی قال بل لا الرامی۔

(مشکل الآثار ۱:۳۷۰)

اللہ تعالیٰ اسے کسی ایسے عیب یعنی زعم میں مبتلا کردے گا کہ قرآنی اثرات اس سے جدا ہوجائیں گے۔ پھر وہ شخص قرآن کو پس پشت ڈال کر اپنے معاشرے میں قرب و جوار کے مسلمان لوگوں کو مشرک قرار دے گا اور ان کے قتل کے درپے ہوگا۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں میں نے سوال کیا یا رسول اللہ ان دونوں میں سے فی الواقع مشرک کون ہوگا۔ مشرک کہنے والا یا وہ جس کو مشرک کہا گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔ دوسرے کو مشرک کہنے والا خود مشرک ہوگا۔

یہ حدیث مسند ابو یعلی میں روایت کی گئی ہے۔ امام احمد بن حنبل، امام یحیی بن معین اور دیگر آئمہ و محدثین نے اس کے راویوں کو ثقہ اور معتبر قرار دیا ہے، آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ان لوگوں کی آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی ہے جو اپنی دینداری اور پارسائی کے زعم میں دوسروں کو بے دین اور مشرک قرار دیتے رہتے ہیں اور اس طرح اپنے انتہا پسندانہ طرز عمل سے مسلمانوں میں تفرقہ و انتشار پیدا کرکے امت واحدہ کا شیرازہ منتشر کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ان لوگوں کو ان کے انتہا پسندانہ طرز فکر و عمل کی وجہ سے مشرک قرار دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنھا بھی ایسے لوگوں کے بارے میں جو ملت کا شیرازہ منتشر کرنے میں مصروف رہتے ہیں اور اپنے مزعومہ عزائم کی تکمیل کے لئے آیات قرآنی کی معنوی

تحریف کے مرتکب ہوتے رہے ہیں، فرمایا کرتے تھے کہ یہ لوگ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں جو بڑی بے باکی اور بے تکلفی سے عام مسلمانوں پر چسپاں کر دیتے ہیں۔

وكان ابن عمر يراهم شرار خلق اللّٰه و قال: انهم انطلقوا الى آيات نزلت فى الكفار ، فجعلوها على المومنين۔

(صحیح البخاری، ۲ : ۱۰۲۴، کتاب استتابۃ المرتدین والمعاندین)

ابن عمر رضی اللہ عنہ ان لوگوں کو مخلوق خدا میں سب سے زیادہ شریر تصور کرتے اور فرماتے تھے کہ یہ ان قرآنی آیات کو جو کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی تھی بڑی آزادی اور جرات مندی کے ساتھ مسلمانوں پر چسپاں کرتے ہیں۔

ملی شیرازہ بندی کی تعلیم

ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ۔

(آل عمران، ۳:۱۰۵)

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے تھے اور جب ان کے پاس واضح نشانیاں آ چکیں اس کے بعد بھی اختلاف کرنے لگے۔

یہاں بھی قرآن حکیم ملی وحدت اور ملت اسلامیہ کی شیرازہ بندی کی تعلیم دے رہا ہے، اور بھی متعدد مقامات پر ایسے احکام صادر ہوئے ہیں، جن میں مسلمانوں کو تفرقہ و انتشار سے اجتناب کرنے اور اتحاد و یک جہتی کو فروغ دینے کی تاکید کی گئی ہے۔ اب غور طلب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کی نظر میں فرقہ پرستی اتنی قابل مذمت اور انتشار و افتراق کی راہ ہے اور جب ہم سب

اس سے متنفر ہیں تو یہ لعنت کیوں ہمارے ملی وجود کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر رہی ہے۔ وقت آن پہنچا ہے کہ ہم فرقہ پرستی کی زبانی مذمت پر ہی اکتفانہ کریں، بلکہ اس کے خاتمے کے لئے ایسا لائحہ عمل اختیار کریں، جس پر سب مسالک اور مکاتب فکر متفق ہو سکیں۔ اور اوائل دور اسلام کی ملی وحدت کی یاد کو پھر سے تازہ کر سکیں۔

دور جاہلیت اور تفرقہ پروری

قبل از اسلام کا زمانہ دور جاہلیت اس لئے کہلاتا ہے کہ اس میں لوگ قبیلوں، گروہوں اور نسل در نسل طبقوں میں بٹے ہوئے ایک دوسرے سے برسر پیکار رہتے تھے۔ بہیمیت اور درندگی اپنے عروج پر تھی اور انسانیت جبر و استبداد کی چکی میں پس رہی تھی۔ ایران اور روم اس وقت کی دو بڑی طاقتیں تھیں جو بے بس انسانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنائے ہوئے تھیں۔ اسلام نے آ کر مجبور و مقہور انسانوں کو قعرِ مذلت سے نکالا اور تہذیب و تمدن کی وہ روشن شمعیں عطا کیں جن کی چکا چوند سے مشرق و مغرب کی نگاہیں خیرہ ہو گئیں۔ تفرقہ پروری کی فضا چھٹ گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک عالمگیر معاشرہ وجود میں آ گیا، جس نے رنگ یا نسل اور مذہب کے سب عصبیتی امتیازات کو یکسر مٹا دیا اور باہمی اخوت و محبت کا انقلابی نظارہ چشم فلک کو دکھا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖ اِخْوَانًا۔

(آل عمران، ۳:۱۰۳)

اور اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم (ایک دوسرے کے) دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کر دی اور تم اس نعمت کے باعث آپس میں بھائی بھائی ہو گئے۔

بعثت محمدی ﷺ اور معجزہ وحدت واخوت

آخر جزیرہ نمائے عرب میں کوہ فاران کی چوٹیوں سے اس نور کامل کا ظہور ہوا جس نے اجڈ اور اکھڑ صحرا نشینوں کی کایا پلٹ دی۔ اور وہ لوگ جو زبردست تعصب اور انتشار کا شکار تھے اور جن کا زیادہ وقت قتل و غارت گری' لوٹ مار اور ایک دوسرے کی عزت و آبرو لوٹنے میں گزرتا تھا۔ اس قدر باہم شیر وشکر ہو گئے کہ اس کی مثال تاریخ انسانی میں کہیں نہیں ملتی۔ یہ عدیم النظیر معجزہ سرور کائنات ﷺ کی بعثت مبارکہ سے رونما ہوا۔ آج بھی عقلیت پرست دنیا انگشت بدنداں ہے کہ یہ عظیم انقلاب کیسے برپا ہو گیا۔ جس کی بنیاد وحدت نسل آدم اور اخوت و محبت کی آفاقی قدروں پر قائم تھی۔ اسی معجزے کا ذکر قرآن حکیم یوں کر رہا ہے کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ نعمتِ خداوندی یعنی بعثت محمدی ﷺ کی برکت سے تمہاری عداوتیں' محبتوں سے بدل گئیں' تمہاری نفرتیں الفتوں سے بدل گئیں' تمہاری تنگ نظریاں' قلبی وسعتوں سے بدل گئیں اور تم آپس میں متحد ہو کر یوں شیر وشکر ہو گئے کہ تمہارے باہمی رشتے خونی اخوت کے رشتوں سے بھی مضبوط تر ہو گئے' ایک دوسرے کی جان لینے والے' ایک دوسرے کی جانوں کے محافظ بن گئے۔ دوسروں کی عزتوں سے کھیلنے والے دوسروں کی عزتوں کے نگہبان بن گئے۔ پھر تمہاری عزتیں ایک عزت میں گم ہو گئیں' تمہاری محبتیں ایک محبت میں گم ہو گئیں اور بالآخر تمہاری منتشر وفاداریاں بھی ایک وحدت میں بدل گئیں۔

ایک ضروری وضاحت

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ خدا رسول نے کسی بھی فرقے اور مسلک کے نام پر جنت کا پروانہ جاری نہیں کیا۔ اگر کوئی اس زعم میں مبتلا ہو کر وہ محض فلاں مسلک سے متعلق ہونے کی بنا پر جنت کا حقدار ہے تو یہ اس کی خام خیالی اور خود فریبی ہے۔ ایسے تصورات

کے پیچھے یہودیوں کی وہی نفسیات کارفرما ہوتی ہے جس کے تحت وہ کہتے تھے کہ جو یہودی ہو گیا اسے جنت کی ضمانت مل گئی۔ جس کی شہادت قرآن حکیم نے یوں فراہم کی ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ط تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ط قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ O (البقرہ، ۲:۱۱۱)	اور (اھل کتاب) کہتے ہیں کہ جنت میں ہرگز کوئی بھی داخل نہیں ہوگا سوائے اس کے کہ وہ یہودی ہو یا نصرانی، یہ انکی باطل امیدیں ہیں، آپ فرما دیں کہ اگر تم (اپنے دعوے میں) سچے ہو تو اپنی (اس خواہش پر) سند لاؤ۔

بخشش اور مغفرت کا دارو مدار کسی طبقے یا فرقے کے عنوان کی بنیاد پر نہیں بلکہ ہر شخص کے ذاتی عقیدے اور عمل صالح کے باعث خدا کے فضل و کرم پر ہے۔ نجات کی کسوٹی یہ نہیں کہ وہ کس فرقے میں سے ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کی تعلیمات کے کتنا قریب ہے۔ سرور دو جہاں ﷺ کی محبت و اطاعت میں کس قدر سچا ہے اور اپنے فکر و عمل سے دین اسلام کا کس قدر متبع اور وفادار ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ وحدتِ ملی کے تصور کو فرقہ پرستی کے ہاتھوں نا قابل تلافی نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے۔ یہ لعنت ہماری زندگی کے لئے زہر ہلاہل کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس سے بڑھ کر ظلم یہ ہے کہ ہم نے اپنے علمی اختلافات و نزاعات کا موضوع بھی ذات مصطفے ﷺ کو بنالیا ہے۔

حضور ﷺ کی ذات، موضوع اختلاف کیوں؟

آنحضرت ﷺ کی ذات ستودہ صفات جس سے کامل محبت اور غیر مشروط غلامی و وفاداری کا رشتہ عین ایمان ہے۔ جو رنگ و نسل پر مبنی تفاخر و عصبیت کے تمام بتوں کو توڑنے اور بنی

نوع انسان کو تشتت وافتراق سے نجات دے کر ایک دینی وحدت کی لڑی میں پرونے کے لئے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہی ذات آج اپنے نام لیواؤں کے مابین اختلاف ونزاع کا موضوع بنی ہوئی ہے۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ بارگاہ مصطفوی ﷺ سے وابستگی کو بنائے اتحاد بنانے کی بجائے مسلمان اسے باہمی تفرقہ، مغائرت، مخاصمت اور نفرت کے شعلوں کی ہوا دینے کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

برین عقل و ہمت بباید گریست

کوئی حضور ﷺ کے وجود کو محلِ اختلاف بناتا ہے، کوئی آپ ﷺ کی حقیقت وحیثیت کو، کوئی آپ ﷺ کے علم وعرفان کو محل اختلاف بناتا ہے۔ کوئی آپ ﷺ کے تصرف وقوت کو، کوئی آپ کی شفاعت وعنایت کو محل اختلاف بناتا ہے، کوئی آپ ﷺ کی سنت وسیرت کو۔ کوئی آپ کے نام کو محل اختلاف بناتا ہے اور کوئی آپ ﷺ کے مقام کو۔

برادران اسلام! آیئے کم از کم ایک عہد تو ہم سب مل کر کریں کے اختلافات کے ہزاروں دائرے ہو سکتے ہیں۔ ان میں حسب ضرورت طبع آزمائی کر لیں گے، مگر ذات مصطفوی ﷺ جو ہر ایک کی محسن بلکہ محسن کون ومکان ہے، اسے محل نزاع بنانے سے گریز کریں گے۔ مسلمانوں کے مابین خدا، رسول، دین، قرآن اور کعبہ پر کوئی اختلاف ونزاع گوارا نہیں کیا جانا چاہیے۔

اتحاد واخوت کے فروغ اور فرقہ پرستی کے خاتمے کا ممکنہ لائحہ عمل

اتحاد واخوت کے فروغ اور فرقہ پرستی کے خاتمے کے لئے درج ذیل اصول وضوابط پر مشتمل ایک ہمہ گیر لائحہ عمل تیار کیا جانا چاہیے۔

۱۔ عقائد واعمال کے مشترک پہلو اور بنائے اتحاد۔

۲۔ مثبت اور غیر تنقیدی اسلوب تبلیغ۔

۳۔ حقیقی رواداری کا عملی مظاہرہ اور عدمِ اکراہ کا قرآنی فلسفہ

۴۔ دینی تعلیم کے لئے مشترکہ اداروں کا قیام

۵۔ علماء کے لئے جدید عصری تعلیم کا انتظام

۶۔ تہذیب اخلاق کے لئے موثر روحانی تربیت کا انتظام۔

۷۔ فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کیلئے چند قانونی اقدامات

i۔ منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی۔

ii۔ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل قومی سطح کی سپریم کونسل کا قیام۔

iii۔ ہنگامی نزاعات کے حل کے لئے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام۔

iv۔ مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کیخلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ۔

عقائد و اعمال کے مشترک پہلو اور بنائے اتحاد

یہ ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے کہ تمام اسلامی فرقوں کے درمیان بنیادی و اعتقادی قدریں سب مشترک ہیں۔ اسلامی عقائد کا سارا نظام انہیں مشترک بنیادوں پر کھڑا ہے۔ مسلمانوں میں سے کوئی بھی کسی اور نبی یا رسول کی شریعت کا نہ انکار کرتا ہے‘ نہ اسلام کے سوا کسی اور دین کو مانتا ہے۔ سب مسلمان توحید و رسالت وحی اور کُتبِ سماوی کے نزول‘ آخرت کے انعقاد‘ ملائکہ کے وجود حضور ﷺ کی خاتمیت‘ نماز روزہ‘ زکوۃ اور حج کی فرضیت وغیرہ جیسے معتقدات اور اعمال پر یکساں ایمان رکھتے ہیں اور اگر کہیں کوئی اختلاف ہے تو صرف فروعی حد تک‘ اور وہ بھی ان کی علمی تفصیلات اور کلامی شروحات متعین کرنے میں ہے۔ اس سے عقائدِ اسلام کی بنیادوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

سب سے پہلی اسلامی ریاست کا قیام

ہادی اعظم ﷺ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اس وقت مدینے کا معاشرہ بالعموم مسلمانوں‘ یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل تھا۔ حضور ﷺ نے اپنی پیغمبرانہ بصیرت اور قائدانہ حکمت عملی سے ان مختلف الخیال عناصر اور متضاد نظریات رکھنے والے طبقوں کو مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست کی تاسیس و قیام کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ منشا صرف یہ تھا کہ اس پہلی اسلامی ریاست کی بقا و سلمیت کا فریضہ باہمی اشتراکِ عمل سے سب کو منظم کر کے سرانجام دیا جا سکے تا کہ ریاست کو اندرونی سطح پر کم سے کم مشکلات کا سامنا ہو۔

قرآن مجید اس دعوت کو اس طرح بیان کرتا ہے:

قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ۔ (آل عمران، ۳:۶۴)

آپ فرما دیں اے اہل کتاب! تم اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔

یہ قرآنی خطاب اہل کتاب بالخصوص یہود سے تھا کہ آؤ! اس عقیدے کی بنا پر سب اکٹھے ہو جاؤ جو تمہارے اور مسلمانوں کے درمیان قدر مشترک ہے اور وہ عقیدہ توحید اور ردِّ شرک ہے، جس پر سب الہامی مذاہب کے پیروکار متفق ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس دعوتِ اتحاد کے نتیجے میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔ جس کا دستور ''میثاق مدینہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا اور یہ اتحاد اس وقت تک عملاً قائم رہا جب تک یہود خود اس کی خلاف ورزی کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اگر اسلامی ریاست کے استحکام کی خاطر غیر مسلموں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کو ایک نقطہ اشتراک کی بنیاد پر دعوت اتحاد دی جا سکتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ ایک خدا ایک نبی، ایک کتاب، ایک دین اور ایک کعبہ کے ماننے والوں کے درمیان اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے اتحاد و یگانگت کے لازوال رشتے قائم نہ کئے جا سکیں اور ملتِ واحدہ کا تصور ایک زندہ جاوید حقیقت نہ بن سکے؟ لیکن یہ کتنی حرماں نصیبی ہے کہ آج فرزندان توحید آقائے دوجہاں ﷺ کی اس سنت سے بہت دور چلے گئے ہیں۔ فرقہ بندی کی عصبیت سے وہ راہ راست سے بھٹک گئے اور انتشار و افتراق کی گمراہ کن راہوں میں کھو گئے ہیں انہیں اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ ان کے مابین سب بنیادی قدریں مشترک تھیں۔ اسلام کی بالادستی اور حاکمیت مصطفوی کے آگے ظاہراً سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے یہودیوں نے بھی آقائے نامدار ﷺ کی دعوت اتحاد کو سیاسی مصلحتوں کی خاطر ہی سہی، قبول کر لیا تھا۔

لیکن آج کے مسلمان تو عملاً یہود سے بھی آگے گزر گئے ہیں کہ اپنے گروہی، مسلکی

جماعتی اور طبقاتی مفادات کی خاطر انہیں رسول اکرم ﷺ کی تعلیم وحدت کا اتنا بھی پاس نہیں رہا کہ اسلام کی کشتی میں سوار ہر فرقہ کشتی ملت کے تختوں کو اکھاڑ اکھاڑ کر سمندر میں پھینک رہا ہے اور کسی کو اتنا بھی خیال نہیں کہ اگر خدانخواستہ یہ کشتی ڈوب گئی تو وہ بھی سب اس کے ساتھ غرق ہو جائیں گے۔

یاد رہے کہ اصولِ توحید کی بنا پر دعوتِ اتحاد اسلام نے غیر اسلامی الہامی مذاہب بالخصوص یہودیت کو دی تھی۔ انہیں رسالت محمدی ﷺ سے وفاداری کی دعوت اس لئے نہیں دی جا سکتی تھی کہ یہی ان کے اور اسلام کے مابین وجہ تفریق تھی۔ اگر وہ حضور ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کی نبوت کے وفادار ہو جاتے تو یہودی کس طرح رہ سکتے تھے۔ لہذا کسی ایسے اصول کو ہی دعوت کے لئے اپنایا جا سکتا تھا جس کے ذریعے وہ یہودی رہتے ہوئے بھی اس اتحاد میں شریک ہو سکتے اور وہ اصول خدا پرستی کا عقیدہ تھا، جس کے دونوں دعویدار تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کے باہمی اتحاد کا تعلق ہے اس کے لئے عقائد و اعمال کی ساری بنیادیں مشترک ہیں توحید، رسالت، ختم نبوت، آخرت قرآن اور وحدت کعبہ سے لے کر ارکان اسلام تک سب کچھ مشترک ہے اور سب سے بڑھ کر ان میں امت محمدی ﷺ کی نسبت کا وہ لازوال باہمی رشتہ بھی موجود ہے جو بیک وقت مسلمانوں کے لئے بنائے اتحاد و یگانگت اور غیر مسلموں کے لئے بنائے امتیاز و مفارقت ہے۔ آخر ان اقدار کی بنا پر ملت اسلامیہ کیوں ایک وحدت نہیں بن سکتی؟

مثبت اور غیر تنقیدی اسلوبِ تبلیغ

اس ضمن میں بنیادی سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تبلیغ کے لئے موضوع کیا ہونا چاہیے اور کون سا انداز و اسلوب اختیار کیا جائے جسے دعوت و تبلیغ کے کاموں کو مربوط اور مشترک بنیادوں پر سرانجام دینے کے لئے تمام مسالک و مکاتب فکر یکساں طور پر اپنا سکیں؟

دعوت و تبلیغ کے موضوعات

تبلیغی کام کو درج ذیل موضوعات کے ساتھ مختص کر دینے سے فرقہ وارانہ کشیدگی، طبقاتی تناؤ اور باہمی آویزش کو ختم کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ا) اعتقادی زندگی کے اصلاح طلب پہلو

ب) عملی زندگی کے اصلاح طلب پہلو

ج) اخلاقی و روحانی زندگی کے اصلاح طلب پہلو

(ا) اعتقادی زندگی اصلاح طلب ہے

عقیدہ ہر انسان بالخصوص مسلمان کے تمام اعمال کی اساس ہوتا ہے۔ اس میں بگاڑ یا اختلاف واقع ہو جائے تو اس کے اثرات پوری زندگی کے افعال و اعمال پر مترتب ہوتے ہیں۔ بحمداللہ مسلمانوں کے تمام مسالک اور مکاتب فکر میں عقائد کے بارے میں کوئی بنیادی اختلاف موجود نہیں ہے، البتہ فروعی اختلافات صرف جزئیات اور تفصیلات کی حد تک ہیں جن کی نوعیت تعبیری اور تشریحی ہے۔ اس لئے تبلیغی امور میں بنیادی عقائد کے دائرہ کو چھوڑ کر محض فروعات و

جزئیات میں الجھ جانا اور ان کی بنیاد پر دوسرے مسلک کو تنقید و تفسیق کا نشانہ بنانا کسی طرح دانشمندی اور قرینِ انصاف نہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ہمارے عقائد مردہ اور بے جان ہو چکے ہیں۔ انہیں ہماری عملی زندگی میں توہمات سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں دیا جا رہا۔ عقیدہ توحید ہو یا عقیدہ رسالت' تصور آخرت ہو یا تصور جزا و سزا ان میں دراڑیں پڑ چکی ہیں۔ ذہن عقائد کے بارے میں بھی پراگندہ خیالی اور تشکیک کا شکار ہیں۔ قلوب و اذہان کو مومنانہ یقین میسر نہیں۔ خدا پر ایمان رکھنے کے باوجود اس پر بھروسہ اور توکل باقی نہیں رہا۔ ہم عقائد کا تحفظ کلامیات اور مناظرانہ استدلال سے کرتے ہیں' جو زندگی کو دولت یقین عطا نہیں کر سکتا۔ کتاب و سنت کے قابل عمل اور عصر حاضر میں نتیجہ خیز ہونے پر بھی ہمارا ایمان متزلزل ہو چکا ہے۔ ہم کفر کے مقابلے میں اسلام اور باطل کے مقابلے میں حق کے کامیاب و کامران ہونے پر بھی اعتقاد ختم کر بیٹھے ہیں۔ الغرض ہمارے عقائد کا سارا ایوان متزلزل اور ڈانواں ڈول ہے' لہذا اس وقت ہمیں عقائد کے کلامیاتی پہلوؤں پر زیادہ زور دینے کی بجائے عقائد کے ان ایمانیاتی اور انقلابی پہلوؤں پر زور دینا چاہیے جن سے مردہ عقائد پھر سے زندہ ہو جائیں اور ان کا تعلق حقیقی زندگی کے ساتھ پھر سے بحال ہو جائے تاکہ عملی زندگی ان عقائد کے اثرات و برکات سے صحیح معنوں میں فیضیاب ہو سکے۔ اگر علماء و خطباء اس رخ پر توجہ کریں تو وہ خود محسوس کر لیں گے کہ اس انداز کی تبلیغ و تقریر بے شمار تنازعات اور اختلافات سے از خود پاک ہو جائے گی اور اگر وہ بعض اوقات عقائد کے بعض پہلوؤں کی وضاحت میں علمی اختلاف کو ناگزیر سمجھیں تو ان کا بیان بھی محض مثبت طریقے سے کتاب و سنت کی روشنی میں اس طرح کر دیا جائے کہ کسی دوسرے مکتب فکر کا نقطہ مورد طعن نہ بنے۔

(ب) عملی زندگی اصلاح طلب ہے

اعتقادی زندگی کے بعد عملی زندگی ہماری خصوصی توجہ کی محتاج ہے' ہماری موجودہ اعمال کی حقیقت ہم سے ڈھکی چھپی نہیں۔ مسلم معاشرہ کس حد تک مسلسل بگاڑ کا شکار ہو چکا ہے' یہ ہم سب کے لئے لمحہ فکریہ ہے۔ انفرادی سطح ہو یا اجتماعی سطح' ہماری عملی زندگی کا کون سا گوشہ ہے' جو فساد اور بدعنوانیوں کی زد میں نہیں ہے۔ قول و فعل میں تضاد' منافقت' ریاکاری' تصنع' کِذب و افتراء روزمرہ معاملات میں فریب دہی' عیاری' مکاری اور چالبازی نے ہماری پوری کی پوری زندگی کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ تبلیغ کے لئے یہ ایک ایسا موضوع ہے جس پر کسی مسلک کے درمیان اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اصلاحِ معاشرہ کا اجتماعی فریضہ تمام فرقوں کے مسلمانوں پر بلا لحاظ مسلک و عقیدہ یکساں طور پر عائد ہوتا ہے۔ معاشرتی اور سماجی برائیوں اور خرابیوں کے خلاف ہمہ گیر جہاد وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جس میں مسلک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو مل کر حصہ لینا چاہیے۔ لہذا تبلیغ و تقریر کا دوسرا موضوع یہ ہو جانا چاہیے کہ ہماری زندگی کا بگڑا ہوا بلکہ تباہ شدہ عملی ڈھانچہ کس طرح سنوارا جا سکتا ہے؟

(ج) اخلاقی زندگی اصلاح طلب ہے

اجتماعی سطح پر اخلاقیات اور روزمرہ عادات و اطوار کے اعتبار سے ہماری زندگی اس قدر انحطاط اور زبوں حالی کا شکار ہو چکی ہے۔ اور ہماری اخلاقی و روحانی اقدار اس درجہ اتھل پتھل ہو چکی ہیں کہ آج کی نسل کا اسلام سے بےزار ہو کر برگشتہ ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے اخلاق و شرافت اور انسانی قدروں کے دعویدار ہوں یا دنیوی جاہ و منصب پر فائز ایثار و قربانی کا درس دینے والے زعماء' آپ اگر ان کے باطن میں جھانکیں تو الا ماشاء اللہ وہ خود غرضی' جاہ طلبی' خواہشات نفسانی اور ان تمام آلائشوں میں ملوث نظر آئیں گے' جو انسانیت کے

دامن پر بدنما داغ ہیں۔ عام مشاہدے کی بات ہے کہ جدید نسل کی بڑھتی ہوئی گمراہی اور بے راہ روی کے ذمہ دار اتنے الحاد و لادینیت کا پرچار کرنے والے نہیں جتنے کہ اسلام کی تبلیغ کرنے والے مبلغ اپنے کردار کی گراوٹ اور فکر و عمل کے تضاد کی وجہ سے ہیں۔ لہذا اولین ضرورت یہ ہے کہ اصلاح کے ان پہلوؤں کو موضوع تبلیغ بنایا جائے۔

اسلام کی حکیمانہ تعلیم

قرآن حکیم میں باری تعالیٰ حضور ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرماتے ہیں:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَ جَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط۔ (النحل، ۱۶:۱۲۵)	(اے رسول معظم) آپ اپنے رب کی راہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلایئے اور ان سے بحث (بھی) ایسے انداز سے کیجئے جو نہایت ہی حسین ہو۔

اس آیت کریمہ میں فروغ اخوت کے لئے حکیمانہ پہلو یہ ہے کہ دعوت اور تبلیغ کا مقصد چونکہ برائیوں کی اصلاح اور اچھائیوں کی تلقین ہوتا ہے، اور یہ حقیقت ہے کہ جب کسی شخص کی کسی برائی کی نشاندہی کی جائے، خواہ وہ اعتقادی ہو یا عملی و اخلاقی تو وہ اسے ناپسند کرتا ہے اور ردعمل کے طور پر کبھی مخالفت بھی کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ خرابی کی اصل جڑ ''نفسِ امارہ اور شیطنت'' ہوتی ہے جو اصلاح کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

لہذا حکم یہ دیا گیا ہے کہ دعوت و تبلیغ میں انتہا درجے کی حکمت و موعظت پیشِ نظر رہنی چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دعوت و تبلیغ میں معمولی سی بے حکمتی کے باعث اصلاح کی بجائے، پہلے سے موجود اخوت اور دوستی کا رشتہ ہی کٹ جائے۔ اس طرح تبلیغ فروغ اخوت کی جگہ فروغ نفاق کا سبب بن جائے گی اور یہ بات فی نفسہ ایک برائی ہے۔ سرور کائنات کی پوری زندگی اس آیت

کی عملی تفسیر تھی۔ مسلمان تو درکنار کافروں اور مشرکوں سے بھی آپ کا رویہ اور طرز عمل انتہائی حکمت وموعظت اور فہم وبصیرت سے عبارت تھا۔ قرآن مجید میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کافروں کے بتوں کو بھی...... گالی نہ دیں کہ ردعمل کے طور پر وہ بھی خدا اور رسول کی شان میں ویسے ہی نازیبا کلمات کہیں گے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ط۔ (الانعام ۶:۱۰۸)

اور (اے مسلمانو!) تم ان (جھوٹے معبودوں) کو گالی مت دو جنہیں یہ (مشرک لوگ) اللہ کے سوا پوجتے ہیں پھر وہ لوگ (بھی جواباً) جہالت کے باعث ظلم کرتے ہوئے اللہ کی شان میں دشنام طرازی کرنے لگیں گے۔

آیہ کریمہ سے صاف ظاہر ہے کہ تبلیغِ حق کے وقت ردِکفر اور ابطالِ باطل کے باوجود کفار کے جھوٹے معبودوں کو گالی دینے پر قدغن لگائی جا رہی ہے۔ اس فرمانِ خداوندی کی تہہ میں حکمت یہ ہے کہ کفار بزعم خویش اپنے آپ کو باطل پر نہیں سمجھتے۔ اگر آپ ان کے جھوٹے معبودوں کو گالی دیں گے تو وہ جواب میں آپ کے سچے معبود پر دشنام طرازی کریں گے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ارشاد فرمایا۔

عن عبداللّٰه بن عمرو بن العاص قال قال ان رسول اللّٰه ﷺ من الکبائر شتم الرجل والدیه قالوا یا رسول اللّٰه و هل یشتم الرجل

عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک بار حضور نبی کریم ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا۔ بدبخت ہے وہ شخص جو اپنے ماں باپ کو گالی دیتا ہے۔ صحابہؓ نے دریافت

والدیه؟ قال نعم یسب ابا الرجل، فیسب اباه و یسب امه فیسب امه۔
(صحیح مسلم، ۱:۶۴۔ کتاب الایمان، باب بیان الکبائر واکبرھا، رقم حدیث:۹۰)

کیا ''یارسول اللہ ایسا کون ہے جو اپنے ماں باپ کو گالی دے تو اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ وہ شخص جو کسی دوسرے کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور دوسرا جواباً اس کے ماں باپ کو گالی دے تو یہ سمجھ لے کہ وہ خود اپنے ماں باپ کو گالی دے رہا ہے۔

ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو بغیر سوچے سمجھے ایک دوسرے کو کافر، مشرک، بدعتی، گستاخ رسول، لعنتی اور جہنمی کہہ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس تکفیر و تفسیق کی زد میں اگر سارے آ گئے تو پھر مسلمان کون بچے گا۔ حضورﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کے رگ و ریشے میں توحید اس درجہ سرایت کر چکی ہے کہ مجھے ان کے دوبارہ شرک کی طرف لوٹ جانے کا مطلق اندیشہ نہیں۔

کلمہ گو کو بلا جواز شرعی کافر نہ کہو

جس شخص نے کلمہ پڑھ لیا اسے کافر کہنا بغیر شرعی حجت کے کس طرح بھی روا نہیں ہے۔ ایک جنگ میں کسی صحابی نے ایک ایسے شخص کو قتل کر دیا۔ جس کے بارے میں بیان کیا گیا کہ اس نے مرنے سے پہلے کلمہ پڑھ لیا تھا۔ حضور نبی کریمﷺ کے سامنے یہ مقدمہ پیش ہوا تو آپؐ نے اس صحابی کو طلب کر کے پوچھا کہ تم نے فلاں شخص کو کیوں قتل کیا۔ درآنحالیکہ اس نے میرا کلمہ پڑھ لیا تھا۔ صحابی نے کہا کہ یا رسول اللہﷺ اس نے دل سے نہیں بلکہ کلمہ دکھاوے کے لئے اور اپنی جان بچانے کے لئے پڑھا تھا۔ اس پر رحمت عالمﷺ نے فرمایا کہ:

افلا شققت عن قلبه حتی تعلم من

تم نے اس کا دل چیر کر دیکھا تھا۔ کہ اس

اجل ذلک قالها ام لا؟ | نے کلمہ دکھاوے کے لئے پڑھا ہے۔

(سنن ابی داؤد، ۳:۴۵، کتاب الجهاد باب علی ما تقابل المشرکون، رقم حدیث:۲۶۴۳)

اس سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہوگیا کہ دل کا حال خدا اور اس کے احلام سے اس کے رسول کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اب کسی کا یہ دعویٰ کرنا کے فلاں کلمہ گو، منافق اور کافر ہے اپنے آپ کو خدا اور رسول کے مسند پر بٹھانے کے مترادف نہیں تو اور کیا ہے؟

مخلوق میں صرف حضور رسالتمآب ﷺ ہی کامل مخبر صادق ہیں

رب العلمین نے اپنے پیارے نبی کو قیامت تک پیش آنے والے تمام واقعات سے باخبر کر دیا اور تمام انسانوں کے ظاہری و باطنی اعمال ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ظاہر کر دیئے تاکہ وہ ان کے ظاہر و باطن سے آگاہ ہو کر موثر طریق پر ان کی اصلاح اور علاج کر سکیں۔

وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (التوبہ، ۹:۱۰۵)

اور فرما دیجئے تم عمل کرو، عنقریب تمہارے عمل کو اللہ (بھی) دیکھ لے گا اور اسکا رسول (بھی) اور اھل ایمان (بھی)۔

روایت ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر یہ حقیقت منکشف کر دی گئی ہے کہ کون مومن ہے اور کون کافر۔ جب یہ بات منافقوں نے سنی تو تمسخر آمیز انداز میں طعنہ زنی کرنے لگے کہ یہ کیسا رسول ہے جو قیامت تک کے حالات سے آگاہ ہونے کا دعوے کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں جانتا کہ ہم کیا ہیں حدیث کے الفاظ ہیں:

قال رسول اللہ ﷺ عرضت علی امتی فی صورها فی الطین کما

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا، آدم علیہ السلام کی طرح مجھ پر میری امت اپنی

عرضت علی آدم و اعلمت و من یؤمن بی و من یکفر بی فبلغ ذالک المنافقین فقالوا استھزاء زعم محمد انه یعلم من یؤمن به و من یکفر ممن لم یخلق بعد و نحن معه و ما یعرفنا فبلغ ذالک رسول اللہ ﷺ فقام علی المنبر فحمد اللہ تعالی و اثنی علیه ثم قال ما بال اقوام طعنوا فی علمی لاتسئلونی عن شیءً فیما بینکم و بین الساعة الانباتکم به فقام عبداللہ بن حذافة السھمی فقال من ابی یارسول اللہ فقال حذافة فقام عمر فقال یا رسول اللہ رضینا باللہ ربا و بالاسلام دینا و بالقرآن اما ما و بک نبیا فاعف عنا عفا اللہ و عنک فقال النبی ﷺ فھل انتم منتھون فھل انتم منتھون۔

(تفسیر خازن، ۱:۳۰۸)

صورت میں پیش کی گئی اور مجھے بتا دیا گیا کہ کون میرے ساتھ ایمان لائے گا اور کون کفر کرے گا۔ یہ بات منافقوں تک پہنچی تو انہوں نے استہزاء کیا کہ محمد ﷺ کا خیال ہے کہ وہ تمام مومنین و کفارین کو جانتے ہیں جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے اور ہم ان کے پاس ہیں لیکن وہ ہمیں نہیں پہنچانتے یہ بات حضور ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ منبر پر کھڑے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے کے بعد فرمایا۔ ان لوگوں کا کیا حال ہوگا۔ جنہوں نے میرے علم کے بارے میں طعنہ زنی کی قیامت تک جس چیز کے بارے میں مجھ سے سوال کرو گے میں تمہیں بتا دوں گا۔ عبداللہ بن حذافہ السہمی کھڑے ہوئے اور کہا یا رسول اللہ ﷺ میرا باپ کون ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا حذافہ۔ حضرت عمر رضیؓ کھڑے ہوئے اور عرض کی یا رسول اللہ ہم اس پر راضی ہیں کہ اللہ ہمارا رب ہے، اسلام ہمارا دین ہے، قرآن

ہمارا امام ہے اور آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ آپ ﷺ ہم سے درگزر فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ سے درگزر فرمائے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا تم باز نہیں آؤ گے؟ کیا تم باز نہیں آؤ گے؟

حضرت ابوموسیٰؓ کی روایت میں ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

ثم قال للناس سلونی عما شئتم۔

(صحیح البخاری، ۱: ۴۶، کتاب العلم، ۲۸ باب الغضب فی الموعظۃ والتعلیم اذا رای ما یکرہ، رقم حدیث: ۹۲)

پھر آپ ﷺ نے لوگوں سے کہا جس چیز کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو مجھ سے پوچھو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے:

فقال لا تسْأَلُونَنِي الْيَوْمَ عَنْ شَيٌ إِلَّا بَيَّنْتُهُ لَكُمْ۔

(صحیح البخاری، ۵: ۲۳۴۰، کتاب الدعوات، باب التعوذ من الفتن، رقم حدیث: ۶۰۰۱)

حضور ﷺ نے فرمایا۔ آج تم جس چیز کے بارے میں مجھ سے پوچھو گے میں تمہیں بیان کرونگا۔

زہریؒ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

قال من احب ان یسال عن شیئی فلیسال فلا تسئلونی عن شی الا اخبرتکم ما دمت فی مقامی هذا فاکثر الناس فی البکاء و اکثر ان

آپ ﷺ نے فرمایا جو کسی چیز کے بارے میں سوال کرنا چاہتا ہے۔ وہ پوچھ لے تم جس چیز کے متعلق بھی مجھ سے پوچھو گے تمہیں بتاؤں گا جب تک میں

يقول سلوني. وقال في مقام آخر قال انس رضی اللہ عنہ قال اليه رجل فقال اين مدخلي يا رسول الله قال النار۔
(صحیح البخاری، ۱:۲۰۰۔ کتاب مواقیت الصلاۃ، رقم حدیث: ۵۱۵)

اس جگہ ہوں۔ لوگوں نے زار و قطار رونا شروع کر دیا اور آپ ﷺ بار بار یہی فرماتے رہے مجھ سے سوال کرو مجھ سے سوال کرو، حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں تب ایک شخص اٹھا اور پوچھنے لگا، یا رسول اللہ بعد از مرگ میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا؟ آپ نے فرمایا دوزخ۔

سوال یہ ہے کہ کیا مخلوق میں سے رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی اور کو ایسا دعوی کرنے کا حق پہنچتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ یہ منصب صرف کائنات کے اس رسول اعظم ﷺ کا ہے، جس کے دائرہ نبوت سے نہ کوئی زمان باہر ہے اور نہ کوئی مکان۔ مگر اس کے علاوہ کسی اور شخص کی زبان ایسا وسیع دعوی نہیں کر سکتی۔ کیونکہ باطن اور آخر کے حالات سے تو فی الحقیقت وہی علاّم الغیوب ہی واقف ہے یا وہ پیکرِ نبوت ؐ جسے باری تعالیٰ نے اپنے خزانہ علم سے دولتِ وافر عطا کی ہے۔

اب اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے باطن اور نیت پر شک کرتے ہوئے بغیر کسی ظاہری شہادت کے اسے منافق کافر و مشرک یا جہنمی اور دوزخی قرار دے گا تو یہ دعوی یا تو ''شرک فی التوحید'' کے مترادف ہوگا یا ''شرک فی النبوت'' کے۔ مسلمانوں کو یقینی علم کے بغیر دوسروں کی نسبت حسنِ ظن رکھنے کی تعلیم دی گئی ہے، کیونکہ نیک گمان سے اخوۃ اور اتحاد قائم ہوتا ہے، جبکہ بدگمانی نفاق و افتراق کا باعث بنتی ہے۔

نصوص قرآن و سنت سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ دین میں رخنہ اندازی اور تفرقہ پروری صریحاً کفر کے مترادف ہے، اس لئے ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کو صرف بنیادی امور پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے اور حتی الامکان فروعی معاملات میں ایک دوسرے سے نہیں

الجھنا چاہیے۔ تبلیغ ودعوت کا موضوع اور اسلوب ایسا ہو جس سے کسی مسلک کے بزرگ کی کردار کشی اور تنقیص وتذلیل کا پہلو نہ نکلے بلکہ مسائل کی تشریح وتعبیر قرآن وسنت کی روشنی میں خالصتاً علمی و فکری اور تعمیری نقطہ نظر سے کی جائے۔

حقیقی رواداری کا عملی مظاہرہ اور عدمِ اکراہ کا قرآنی فلسفہ

قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

لَا اِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔ (البقرہ، ۲:۲۵۶)	دین میں کوئی زبردستی نہیں بے شک ہدایت گمراہی سے واضح طور پر ممتاز ہو چکی ہے۔

مندرجہ بالا آیہ کریمہ میں باری تعالیٰ نے دین اسلام کے عمومی مزاج کو بیان کیا ہے، یعنی دین کے اندر کسی قسم کا جبر، تنگی اور سختی نہیں ہے۔ دین کی پوری عمارت لا اکراہ کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے اور اشاعت وتوسیع اسلام میں یہی اصول پہلے دن سے لے کر آج تک کارفرما رہا ہے۔ آیہ کریمہ کے پہلے حصے میں بڑی صراحت کے ساتھ اس اصول کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ دینی تعلیمات کا سارا نظام اسی اصول کے گرد گھومتا ہے۔ تاریخ اسلام اس بات پر شاہد عادل ہے کہ کرہ ارض پر اسلام بالجبر اور بزور شمشیر نہیں پھیلا، بلکہ کردار وعمل کی قوت اور حکمت وموعظت سے لوگوں کے قلوب مسخر کرتا چلا آیا ہے۔ آیت مقدسہ کے دوسرے حصے میں رشد و ہدایت اور گمراہی و ضلالت کا واضح طور پر ایک دوسرے سے ممیّز ہونا بیان کیا گیا ہے۔ حق و باطل اور صدق وکذب کی جداگانہ راہوں کی واضح طور پر نشان دہی کر دی گئی ہے اور ہر کس و ناکس کو پورا اختیار دے دیا گیا ہے کہ وہ جو راہ چاہے، اختیار کرے۔ اس پر کسی قسم کا جبر یا زبردستی نہیں ہوگی۔ ہر انسان اپنے لئے زندگی کا راستہ وطریق منتخب کرنے میں کلی طور پر آزاد چھوڑ دیا گیا ہے، کسی کو حق حاصل نہیں کہ وہ جبر و زیادتی سے اپنا راستہ اور طریق زندگی دوسرے پر ٹھونسنے کی کوشش کرے۔ ہاں البتہ حکمت و

موعظت اور تبلیغ و تلقین سے کسی کو قائل کر لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

قرآن حکیم میں ایک مقام پر رسول اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے:

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (الکھف، ۲۹:۱۸)	اور فرما دیجئے کہ (یہ) حق تمہارے رب کی طرف سے ہے پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے انکار کردے۔

اگر اللہ تعالیٰ کفر و ایمان کے بارے میں تم پر اپنی مرضی اور مشیت مسلط کرنا چاہتا اور تم سے اختیار کی قوت سلب کر لیتا تو اس کی رضا و مشیت کے آگے کسی کو سرتابی کی مجال نہ تھی۔ اگر وہ چاہتا تو روئے زمین پر ایک بھی کافر نہ رہتا۔ لیکن اس قادر مطلق کی مشیت یہی ہے کہ دنیا میں کفر و اسلام، حق و باطل، خیر و شر، نیکی اور برائی کی جدا جدا راہیں متعین کر دی جائیں اور انسان کو ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینے کا اختیار تفویض کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے رسولوں اور نبیوں کے ذریعے گم کردہ راہ انسانیت کی رشد و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہاں تک کہ نبی آخر الزماں ﷺ سے یہ سلسلہ تکمیل کو پہنچا جن کا اسوہ زماں و مکاں کی حدود سے ماوراء تمام نوع انسانی کے لئے مکمل نمونہ حیات ہے۔ باری تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِo (البلد، ۱۰:۹۰)	اور ہم نے اسے (خیر و شر کے) دو نمایاں راستے (بھی) دکھا دیئے۔
فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰهَاo (الشمس، ۸:۹۱)	پھر اس نے اسے اسکی بدکاری اور پرہیز گاری (کی تمیز) سمجھا دی۔

گویا دین سے عنصرِ جبر خارج کر کے ہر شخص کو شعور کی دولت سے بہرہ ور کر دیا گیا۔ اسے رد و قبول کا حق دیا گیا کہ وہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھے اور برضا و رغبت جو دین چاہے اختیار کرے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو جزا و سزا، عذاب و ثواب کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ دین کی راہ واضح

طور پر متعین کر دینے کے بعد خدائے بزرگ و برتر نے کسی کو یہ حق نہیں دیا کہ مذہب کے بارے میں کسی پر پابندی عائد کرے یا کسی کی آزادی پر کوئی قدغن لگائے۔

مقصدِ بعثتِ نبوی ﷺ

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (الاعراف، ۷:۱۵۷)

اور ان سے انکے بارِ گراں اور طوق (قیود) جو ان پر (نافرمانیوں کے باعث مسلط) تھے، ساقط فرماتے (اور انہیں نعمت آزادی سے بہرہ یاب کرتے) ہیں۔

حضور نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں آسان دین لے کر مبعوث ہوا ہوں۔ ظہور اسلام سے پہلے انسانیت ناروا پابندیوں اور جبر و ستم کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی اور مجبور و مقہور انسان ظلم و استبداد کی چکی میں پس رہے تھے۔ محکومی و غلامی کے عالم میں انسان جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہے تھے۔ اسلام نے غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیا اور سب ناروا پابندیوں کو یکسر ختم کر دیا۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی تبلیغی زندگی میں یہ بنیادی اور ناقابل تغیر اصول بطور معیار اپنایا کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت یا عدمِ اطاعت کے بارے میں جبر و اکراہ کا کوئی عمل دخل نہ ہو۔

قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَ مَنْ تَوَلّٰی فَمَا اَرْسَلْنٰکَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًاO (النساء، ۴:۸۰)

جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ (ہی) کا حکم مانا اور جس نے روگردانی کی تو ہم نے آپ کو ان پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجا۔

یعنی اگر کوئی دعوتِ اسلام قبول کر لیتا ہے تو وہ ہدایت پا گیا اور اگر وہ اسے قبول کرنے سے انکاری ہے تو آپ ﷺ بری الذمہ ہیں۔ آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا' لوگوں کو بالجبر دائرہ اسلام میں داخل کرنا آپ کے منصبِ رسالت میں شامل نہیں۔ اسلام کی تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ کسی بھی دور میں تبلیغی مساعی کے دوران کوئی ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی شخص کو زبردستی یا بزورِ شمشیر مسلمان ہونے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اسلام میں عسرت اور تنگی نہیں بلکہ فراخی اور آسانی ہے۔ یہاں تک کہ اضطراری حالت میں لقمہ حرام کھا کر بھی جان بچانا جائز ہے' ارشاد ہوتا ہے:

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ط

(البقرہ' ۲:۱۷۳)

پھر جو شخص سخت مجبور ہو جائے نہ تو نافرمانی کرنے والا ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا تو اس پر (زندگی بچانے کی حد تک کھا لینے میں) کوئی گناہ نہیں۔

قرآن کریم کی ان آیات مقدسہ اور سنت نبوی سے یہ نکتہ روز روشن کی عیاں ہو جاتا ہے کہ دین متین کی تبلیغ اور دعوت حق میں زبردستی اور جبر کا عنصر منشائے خداوندی کے سراسر منافی ہے۔ اسی اصول پر حضور نبی اکرم ﷺ آپ کے جانثار صحابہؓ اور آپ کے بعد آنے والے صلحائے امت ہمہ وقت کاربند رہے۔ اب کسی واعظ اور مبلغ کو منبر پر کھڑے ہو کر یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی پر اپنا مسلک اور نقطہ نظر زبردستی مسلط کرے اور اختلافِ رائے رکھنے والے کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دیتا پھرے۔

اختلافِ رائے کا بنیادی حق

اسلام کی روح میں مشاورت و جمہوریت کارفرما ہے، وہ تمام انسانوں سے مساوات اور برابری کی سطح پر مخاطب ہوتا ہے۔ آقائیت اور پاپائیت کا تصور اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ

نہیں۔مزید برآں دعوت دین اور تبلیغ حق کا فریضہ ادا کرتے ہوئے شائستگی اور متانت کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا یکسر روا نہیں۔اسلام کی رواداری اور وسیع المشربی جو اس بات کی متقاضی ہے کہ مخالفین کے نقطہ نظر کو تحمل، خندہ پیشانی اور قوتِ برداشت سے سنا جائے اور کسی پر زبردستی اپنی بات نہ ٹھونسی جائے۔خالقِ کون و مکان نے جب حضور سرور کائنات ﷺ کو جملہ تشریعی و تکونی اختیارات کے باوجود اس بات کا مکلّف اور ذمہ دار نہیں ٹھہرایا کہ آپ ﷺ کسی کو اسلام قبول کرنے کے لئے مجبور فرمائیں، جبکہ آپ ﷺ کی رضا کو ماننا ہی عین دین اور آپ کی منشا پر عمل کرنا ہی عین شریعت ہے تو پھر کسی مبلغ کو یہ حق کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ دوسروں سے اختلاف رائے کا حق چھین لے، مخالفین پر عرصہ حیات تنگ کر دے اور ان کے اسلام اور ایمان پر زبان طعن دراز کرتا پھرے۔ اختلاف رائے کا حق اسلام کے تصور شورائیت اور جمہوریت کا جزوِ لاینفک ہے۔حضور اکرم ﷺ کے اسوہ حسنہ سے واضح ہے کہ آپ اہم امور میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ لیتے اور اختلاف رائے کا احترام بھی کرتے تھے۔جیسا کہ غزوہ احد کے موقعہ پر حضور نبی اکرم ﷺ نے اپنی رائے کے برعکس صحابہؓ کی رائے کے مطابق مدینہ کی حدود سے باہر جنگ لڑنے کا فیصلہ فرمایا۔اس طرح حضور ﷺ نے اپنے عمل سے تعلیم امت کے لئے ایک ایسا اصول متعین کر دیا جس کی تقلید بلا امتیاز تمام مسلمانوں کے لئے فرضِ عین کا درجہ رکھتی ہے۔

اس ضمن میں ایک صحابیہؓ کا واقعہ پیش نظر رہے جو اپنے شوہر سے علیحدگی کی خواستگار تھی اور اس کا شوہر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔صحابی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ آپ اسے فرمائیں کہ مجھ سے جدا نہ ہو۔میں اسے اپنے عقد میں رکھنا چاہتا ہوں۔حضور ﷺ نے اس صحابیہؓ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تو اپنے شوہر سے کیوں جدا ہونا چاہتی ہے اور پھر فرمایا کہ تو اس سے اپنا عقد نکاح برقرار رکھ۔صحابیہؓ نے دریافت کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ اگر یہ مشورہ ہے تو مجھے اپنا حق استعمال کرنے کی اجازت

دی جائے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اسے اپنا حق استعمال کرنے کی اجازت دے دی اور فرمایا کہ جا شریعت نے اس بارے میں تجھے کلی اختیار دیا ہے۔ اس واقعے کو روایت میں یوں بیان کیا گیا ہے۔

عن ابن عباس ان مغيثًا كان عبداً فقال يا رسول الله اشفع لی اليها (بريره) فقال رسول الله ﷺ يا بريرة اتقى الله فانه زوجک و ابو ولدک فقالت يارسول الله أتامرنی بذاک؟ قال لا انما انا شافع و فكان دموعه تسيل على خده فقال رسول الله ﷺ للعباس الاتعجب من حب مغيث بريدة و بغضها اياه۔

(سنن ابوداؤد، ۲: ۲۷۰، کتاب الطلاق، باب فی المملوکۃ تعتق وھی تحت حراوعبدا، رقم حدیث: ۲۲۳۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک مغیث غلام عرض گزار ہوا یا رسول اللہ ﷺ! عورت کے بارے میں میری سفارش فرمایئے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اے بریرہ! اللہ سے ڈرو کیونکہ وہ تمہارا خاوند اور تمہارے لڑکے کا باپ ہے۔ بریرہ عرض گزار ہوئیں کہ یا رسول اللہ! اس بات کا آپ مجھے حکم فرما رہے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا نہیں بلکہ میں تو سفارش کر رہا ہوں۔ اس مغیث کے آنسو رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ کیا مغیث کی بریرہ سے محبت اور اس کی اس سے نفرت تمہیں حیران نہیں کرتی؟

حضور ﷺ کی سنت کے یہ نظائر بیان کرنے کا مقصد دل و دماغ میں یہ تصور جاگزیں کرنا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی میں دوسروں کو اختلاف کا حق دینا خود حضور ﷺ کی سنت مبارکہ اور سیرت طیبہ سے ثابت ہے۔

دینی تعلیم کے لئے مشترکہ اداروں کا قیام

مذہبی رواداری سے متعلق ایک اوراہم اصول جوغور وفکراور توجہ کامحتاج ہے، وہ علماء کرام اور مبلغین کی تعلیم وتربیت کے لئے ایسے دینی اداروں کے قیام وانصرام سے متعلق ہے۔ جہاں مسلکانہ تنگ نظری سے ماوراء ہوکر ہر مسلک ومکتب فکر کا طالب علم ایک آزاد ماحول میں درس و تدریس کے مواقع سے استفادہ کرسکے۔ برصغیر میں فرقہ وارانہ کشیدگی کے دور کا آغاز مختلف مسالک کی دینی درسگاہوں اور تدریسی اداروں کے جداگانہ قیام سے ہوا' یہ انتہائی افسوس ناک بات تھی۔ اس دور میں مختلف مکاتب فکر کے جدا جدا مدارس معرضِ وجود میں آ گئے۔ ان درس گاہوں سے تعلیم وتربیت پانے والے طالب عالم ایک مخصوص ماحول میں تحصیل علم کے بعد جب باہر نکلے اور مسندِ علم وارشاد پر فائز ہوئے تو ان کے دل ودماغ مسلک کے سانچوں میں ڈھلے ہوئے تھے اوران کی اعمال وکردار پر اس وابستگی کی گہری چھاپ نمایاں تھی۔علماء کی یہ کھیپ مساجد کے محراب ومنبر سے دین کے بنیادی مسائل سے صرف نظر کرکے اپنے اپنے مسلک اورعقائد کا پرچار کرنے لگی۔فروعی امور میں الجھ کرعلماء ایک دوسرے کو معاندانہ تنقید اور تفسیق کا نشانہ بنانے لگے۔اس طرح مسلکی رواداری کے برعکس انتہا پسندی جڑ پکڑ گئی اورفرقہ پرستی اورتفرقہ پروری کی آگ بھڑک اٹھی ،جس سے انتشار وافتراق' فتنہ وفساد اورنا اتفاقی نے جنم لیا اوروحدتِ ملی کے تصور کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔نتیجتاً امت گروہوں اور دھڑوں میں بٹ گئی۔ اس سے اسلام کی اجتماعی حیثیت ضعف وانحطاط کی زد میں آ گئی۔اس صورت حال سے درد ِدل رکھنے والا ہر مسلمان ملول ودل گرفتہ ہے۔مسلکی رواداری اور وسیع المشربی کو پھر سے بحال کرنے کے لئے وسیع

بنیادوں پر ایسے دینی تدریسی ادارے اور مدارس قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے جہاں پر ہر مکتب فکر سے تعلق رکھنے والے طلباء آزادانہ ماحول میں تعلیم حاصل کریں اور اس طرح باہم اختلاط سے خوش گوار اور صحتمند دینی فضا قائم ہو سکے۔ ایسے اداروں کے فارغ التحصیل علماء جب عملی زندگی میں داخل ہوں گے تو ان کے درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے کا اسلوب مناظرانہ نہیں بلکہ مثبت، پروقار، علمی، تحقیقی، استخراجی اور مشفقانہ انداز کا ہوگا۔

علماء کے لئے جدید عصری تعلیم کا انتظام

برطانوی استعمار نے برصغیر میں وارد ہوکر سب سے پہلا تخریبی کام یہ کیا کہ مسلمانوں کے اس نظامِ تعلیم کو تباہ کر دیا جو مدت سے یہاں رائج تھا۔ اس نے دینی و دنیوی تعلیم کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ ایسا کرنے میں اس کے اپنے سامراجی عزائم کارفرما تھے۔ عام تعلیم کو لادینیت (Secularism) کے رنگ میں رنگ دینے سے مسلمانوں کی شاندار اقدار زوال پذیر ہوگئیں۔ آج سے ڈیڑھ دوسو سال قبل تک مسلمانوں کے دینی اور دنیوی تعلیم کے مدارس ایک ہی ہوتے تھے اور جداگانہ نظام تعلیم کا کوئی تصور موجود نہ تھا ایک ہی درسگاہ سے طلباء کو سائنس، ریاضی، فلسفہ، منطق، حدیث و قرآن اور فقہی علوم پڑھائے جاتے تھے۔ گویا دینی اور عصری علوم و فنون ایک ہی نصاب کا حصہ تھے۔ انگریز کے شاطر دماغ نے اپنی ریشہ دوانیوں سے ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لئے سیکولر نظام تعلیم ملک بھر میں رائج کر دیا۔ ایسے نظام تعلیم سے عالم اسلام میں کوئی رومی، رازی، فارابی، جامی اور ابن رشد جیسا ہمہ جہت عالم، مفکر اور دانشور کیسے پیدا ہوسکتا تھا؟

تاریخ اسلام کے زریں دور میں بغداد اور قاہرہ جیسے بڑی بڑی اسلامی یونیورسٹیوں اور درسگاہوں میں اکتساب علم کے لئے شرق و غرب سے کشاں کشاں لوگ چلے آتے تھے۔ پھر تاریخ کا پہیہ پلٹا اور صورت احوال یہ ہوگئی کہ آج اپنی زبوں حالی اور کم مائیگی کو دیکھ کر کوئی بھی دردمند مسلمان خون کے آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جداگانہ نظام تعلیم کے مضر اثرات

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دور عروج میں مسلمان علماء و محققین اور سائنس دانوں نے علم وفن کے میدان میں حیرت انگیز انکشافات اور ایجادات کی ہیں۔ آج سائنسی علوم و فنون میں جس قدر ترقی اور ارتقاء ہو رہا ہے، اس کا سہرا مسلمان محققین اور ماہرین علوم کے سر ہے، جس سے کسی کو اختلاف نہیں ہوسکتا۔

مسلمانوں کے دینی اداروں سے وابستہ علماء و محققین کی علمی ثقاہت کا سکہ دینی اور دنیاوی ہر دونوعیت کے علوم پر جاری تھا۔ تعلیم و تدریس کا یہ نظام بڑی کامیابی سے دنیائے اسلام کی پوری تاریخ میں چلتا رہا۔ پھر برطانوی سامراج نے برصغیر کے مسلمانوں کے خلاف سازش کرکے سیکولر نظام تعلیم رائج کردیا اور یوں مسلمانوں کی علمی برتری کی کمر توڑ دی گئی۔

دنیوی اور دینی تعلیم کی اس ثنویت (Duality) اور ان کے دو حصوں میں منقسم ہو جانے (Bifercation) سے مسلم معاشرے پر انتہائی مضر اثرات مترتب ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی کہ دینی اداروں سے فارغ التحصیل علماء مولوی تو بن گئے، جن کا کام نکاح خوانی اور مُردوں کی تجہیز و تکفین کے علاوہ کچھ نہ تھا، لیکن علمی دنیا پر حکمرانی کرنے والے سکالر نہ بن سکے ایک زمانہ تھا کہ مولوی کا لفظ آج کے پی ایچ ڈی (Ph.D) اور علوم وفنون کے ماہر کے مترادف تصور کیا جاتا تھا۔ تاریخ میں ملا علی قاری کے پائے کے محدث اور عبدالرحمٰن جامی جیسے فقیہہ کا ذکر بڑے احترام سے ملتا ہے۔ جو اپنے زمانے میں ملا کہلایا کرتے تھے۔ آج ملا کا لفظ تحقیر و نفرت کی علامت بن گیا ہے۔

ببین تفاوت راہ از کجا تا بہ کجاست

آج کا مسلمان دنیاوی علوم کی شان و شوکت اور چکا چوند کے مظاہر سے مسحور ہو کر رہ گیا

ہے اور دینی تعلیم کی طرف اس کا رجحان الا ماشاء اللہ بہت کم ہو گیا ہے۔ کالجوں، یونیورسٹیوں میں جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد کوئی انتظامی امور کے شعبے میں چلا جاتا ہے اور کوئی پروفیسر، ایڈووکیٹ، جج، وزیر یا سیاستدان بن جاتا ہے۔ عملی میدان میں مقابلہ و مسابقت کی بنیاد پر یہ راہیں سب کے لئے کھلی ہیں۔ دینی تعلیم کے حصول کی طرف صرف وہی لوگ آتے ہیں، جنہیں جدید تعلیم کے وسائل میسر نہیں آتے یا جو ذہنی طور پر کمزور ہوتے ہیں، چنانچہ ان اداروں سے نکل کر ان کے سامنے اپنی شخصیت اور انفرادیت کو اجاگر کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ وہ مسجد و مکتب میں نزاعی اور اختلافی مسائل کو شد و مد سے ہوا دیں؟ اس طرح فتنہ پرستی کا پودا تناور ہو کر امت مسلمہ کے لئے بہت بڑا چیلنج بن جاتا ہے۔

جدید تعلیم کی ناگزیریت

دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ جدید تعلیم کا حصول وقت کی بہت بڑی ضرورت ہے اس کے بغیر عہد حاضر کے مسائل اور بدلتے ہوئے تقاضوں سے احسن طریق سے عہدہ برا ہونا ممکن نہیں۔ آج کے اس سائنسی اور مشینی دور میں انسانی معاشرے کو جو گوناگوں پیچیدہ مسائل درپیش ہیں، قرآن و سنت کی روشنی میں اس کا حقیقت پسندانہ (Realistic) اور وقتی ضروریات کے مطابق عملی حل (Practicabal Solution)، تب ہی دریافت کیا جا سکتا ہے، جب ہمارے علماء جدید تعلیم سے کما حقہ بہرور ہوں۔ جدید تعلیم کو عام کر دینے سے وسعت قلب و نظر کے باعث فرقہ پرستی کی لعنت سے کافی حد تک چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ بصورت دیگر موجودہ ماحول کو سو سال کی مسلسل کاوشوں سے بھی ختم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ عام مشاہدہ ہے کہ دینی مدرسوں کے فاضل علماء نور و بشر اور حاضر و ناظر جیسے موضوعات پر تو گھنٹوں تقریر کر سکتے ہیں لیکن امت مسلمہ کو درپیش جدید مسائل جیسے اسلام کا معاشی

نظام، بین الاقوامی تعلقات، اقوام عالم کے ساتھ جنگ وصلح کے ضابطوں، اسلامی تہذیب وثقافت، سیاسی پالیسی، اسلامی تعزیرات اور اسلامی معاشرت کے استحکام کے ضابطے کے الا ماشاءاللہ بہت کم معلومات رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آج کی نوجوان نسل دینی علوم سے بے بہرہ اور فرقہ پرست علماء سے حد درجہ بیزار نظر آتی ہے۔

معاشرے کی اجتماعی ذمہ داری

موجودہ حالات کا اگر ہم سنجیدگی اور غیر جانبداری سے مطالعہ کریں تو اس گھمبیر صورت حال کے ذمہ دار صرف علماء ہی نہیں بلکہ معاشرہ من حیث الکل مورد الزام ٹھہرتا ہے۔ اگر کبھی ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں اور ایک لمحہ کے لئے سوچیں کہ ہم دنیاوی معاملات میں اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرتے۔ کیا کیا خواب نہیں دیکھتے کہ ہمارے بچے بہتر سے بہتر درسگاہوں میں اعلٰی تعلیم حاصل کر کے اونچے عہدوں اور مرتبوں پر فائز ہوں، لیکن کیا کسی نے اپنے بچوں میں سے ایک بچہ بھی میڈیکل کالج یا انجینئرنگ یونیورسٹی کی بجائے دینی تعلیم کے لئے وقف کیا ہے۔ یہ سب کے لئے اور بالخصوص ان متمول لوگوں کیلئے لمحہ فکریہ ہے، جو اللہ تعالٰی کے فضل سے معاشرتی احتیاج وضرورت سے بے نیاز ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ خدمت دین کے جذبے سے سرشار ہو کر آگے آئیں اور اپنے بہتر صلاحیتوں کے مالک بچوں کو دنیاوی تعلیم کے ساتھ اسلام علوم کے زیور سے آراستہ کریں۔ اس طرح بہتر، بالغ النظر اور پختہ خیال افراد دین کی خدمت کے لیے مہیا ہوسکیں گے اور ایک خاموش اسلامی انقلاب کی معاشرے میں داغ بیل ڈالی جاسکے گی۔

اجتہاد کی عملی ضرورت

پہلے واضح کیا جا چکا ہے کہ عصری تقاضوں سے کما حقہ عہدہ براء ہونے کے لئے عام

اور حکومت کو اپنی اپنی سطح پر تمام ممکنہ وسائل بروئے کر لانے چاہیں، طرح طرح کے معاشی' اقتصادی' سیاسی اور بین الاقوامی مسائل رونما ہو رہے ہیں' یہ حکومت اور عوام کی انتہائی اہم اجتماعی ذمہ داری ہے کہ وہ مسائل کے خاطر خواہ اور مثبت حل کے لئے جدید تقاضوں کے تحت قرآن و سنت کی تشریح و تعبیر کا کام نہایت حزم و احتیاط سے ان علماء کو سونپیں، جو اس کام کی بطریق اولیٰ اہلیت رکھتے ہوں۔ اختلافی اور ما بہ النزاع امور کا ایسا متفقہ حل بذریعہ اجتہاد قرآن و سنت سے استنباط کیا جائے، جو آگے بدلتے ہوئے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ لیکن اجتہاد کا یہ حق صرف قرآن و سنت سے ماخوذ شریعت پر عبور رکھنے والے علماء ہی کو حاصل ہے، جس کا استعمال جدید علوم سے مستفید ہوئے بغیر ممکن نہیں۔ عملی زندگی کے تمام گوشوں پر محیط اجتہاد مسلکی رواداری اور تمام تر توجہ ان اجتہادی نوعیت کے بنیادی مسائل پر مرکوز رکھنے ہی سے ممکن ہے، جو آج ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں۔ اجتہاد کے فیوض و برکات سے پوری طرح متمتع ہونے کیلئے یہ اشد ضروری ہے کہ عصر جدید کے تقاضوں سے پیدا ہونے والے نئے نئے مسائل پر مسلسل تحقیقی کام باہم مل جل کر کیا جائے۔ کاوش و تحقیق (Research) جدید مسائل پر مرتکز کر دینے سے اختلافی مسائل پر توجہ کافی حد تک ختم ہو کر رہ جائے گی اور مثبت سوچ کی نئی راہیں کھلیں گی۔ اس طرح دور حاضر کے پریشان کن مسائل از خود حل ہوتے چلے جائیں گے۔

تہذیب اخلاق کے لئے موثر روحانی تربیت کا نظام

تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن کے لئے تعلیم و تربیت کے علمی نظام کا احیاء کیا جائے اور ایسے مراکز قائم کئے جائیں جو قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کی مثالی خانقاہوں کا معاشرے میں اخلاقی اور روحانی انقلاب برپا کرنے کا کام پھر سے بحال کرسکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے عملی تصوف کی تعلیمات کو پھر سے اس طرح زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی اقدار پھر سے اجاگر ہو جائیں، جن کو عملی زندگی کے ہر گوشے میں راسخ کرنے کے لئے سلسلہ در سلسلہ اولیائے کرام آتے رہے۔ جامد خانقاہیت اور ظواہر پرستی پر مبنی تصوف نے اسلام کی روح کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اس کے ازالہ کی بس یہی صورت ہے کہ عملی تصور کے اسباق کو روحانی تربیت کے ذریعے عام کیا جائے۔ تاکہ لوگوں کے دل نفاق و کدورت سے پاک ہو کر اخلاص و محبت کی دولت سے مالا مال ہوسکیں۔

تاریخ اسلام میں افراد انسانی کی باقاعدہ اخلاقی و روحانی تربیت اور کردار سازی کے مقدس کام کا آغاز عہدِ رسالت سے مسجد نبوی ﷺ میں اصحاب صفہ کے تربیتی ادارے کی صورت میں ہوا تھا۔ عہد صحابہ و تابعین کے بعد قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ میں یہ فریضہ صوفیائے کرام کی زیر نگرانی ''خانقاہی نظام'' نے سرانجام دیا۔ اس نظام کے زیرِ اثر امتِ مسلمہ کو ہر دور میں جنیدؒ و بایزیدؒ جیلانیؒ و غزالیؒ، رومیؒ جامیؒ، ہجویریؒ و اجمیریؒ سہروردیؒ و سرہندیؒ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور شاہ ولی اللہ دہلویؒ جیسے نابغہ روزگار میسر آتے رہے، جنہوں نے اسلام کے دورِ زوال میں بھی امت

کے عُروقِ مردہ میں نہ صرف نئی روح پھونکی بلکہ اسے احیاء وتجدید اور وحدت و یک جہتی کی نئی راہیں دکھائیں۔ دورِ اواخر میں مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی زوال کے نتیجے میں اس اخلاقی و روحانی تحریک کا شیرازہ بھی منتشر ہوگیا۔ اس کی رسم تو مسخ شدہ صورت میں باقی رہ گئی، لیکن اس کی روح اور انقلابی اثر انگیزی باقی نہ رہی۔ یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے بیشتر رہنماؤں میں وہ اخلاقی جرات' روحانی ولولہ اور صدق و اخلاص مفقود ہوگیا جو احوال زمانہ کا رخ بدلنے کے لئے ضروری ہے۔

لہذا آج اس اخلاقی اور روحانی نظام کی اصل صورت کو بحال کرنے کے لے ایک ہمہ گیر روحانی تحریک کی ضرورت ہے۔ جو اسوہ نبوی ﷺ کی روشنی میں مکارم اخلاق کی تکمیل اور افراد کی ظاہری و باطنی تعمیر کا بھرپور اہتمام کریں اس عملی تربیت سے خواص و عام کے دلوں کو صدق و اخلاص' تقوی و پرہیزگاری' ایثار و قربانی' تواضع و انکسار اور علم و معرفت جیسے وہ لازوال جواہر نصیب ہوں گے، جن سے ان کی شخصیتیں اسوہ صحابہؓ کے رخ پر ڈھل سکیں گی اور وہ سیرت و کردار کی روحانی قوت اور اخلاقی عظمت کے باعث اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے صحیح معنوں میں ممد و معاون ثابت ہوسکیں گے۔ اگر اہل علم کی شخصیتوں کو یہی رنگ نصیب ہوجائے تو ان کی تبلیغ یقیناً امت کو وحدت اور یکجہتی کی دولت عطا کرے گی۔

فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لئے چند قانونی اقدامات

فرقہ پرستی کے محرکات، عوامل اور اسباب کی نشان دہی کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے اس کے سدباب کے لئے اہل اسلام کے سامنے ایک ایسا مفصل لائحہ عمل تجویز کیا ہے، جس پر کاربند ہو کر فرقہ پرستی کا اگر مکمل استیصال نہیں تو کم از کم اس کے مضر اثرات کا ازالہ کر کے انجام کار ملت اسلامیہ کی وحدت کے تصور کو عملی جامہ پہنچایا جا سکتا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ فرقہ پرستانہ سرگرمیوں کے خاتمے کے لئے درج ذیل قانونی اقدامات کئے جائیں۔

۱۔ منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی

۲۔ تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل سپریم کونسل کا قیام

۳۔ ہنگامی نزاعات کے حل کے لئے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام

۴۔ مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کے خلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ

منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کی حوصلہ شکنی

فرقہ پرستی کے رجحانات پر گفتگو کے دوران اس کی صورتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ جس کی پہلی صورت کو صریح فرقہ پرستی اور دوسری کو منافقانہ فرقہ پرستی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ منافقانہ فرقہ کے بارے میں قرآن مجید میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتا ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ٥ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ٥

(البقرۃ، ۲:۱۱۔۱۲)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد بپا نہ کرو، تو کہتے ہیں ہم ہی تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ آگاہ ہو جاؤ! یہی لوگ (حقیقت میں) فساد کرنے والے ہیں۔ مگر انہیں (اس کا) احساس تک نہیں ہے۔

مندرجہ بالا آیت میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے، جنہوں نے وحدت ملی سے منہ موڑ کر فتنہ فساد کی راہ اختیار کر رکھی ہوتی ہے اور جب انہیں اس روش سے باز آنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ مٹھی بھر لوگ بزعم خویش خود کو مصلح کے روپ میں پیش کرتے ہیں، حالانکہ وہ فی الواقع معاشرے میں فساد برپا کرنے کا موجب بن رہے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس کا شعور نہیں رکھتے اور انجام سے بے خبر اپنی دھن میں مگن رہتے ہیں۔

صریح فرقہ پرستی کا شکار ایسے لوگ ہوئے، جن کی تعلیم و تربیت مخصوص مسلکی ماحول میں ہوئی اور دینی مدارس میں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد جب وہ عملی زندگی کے میدان میں داخل ہوئے تو انہوں نے مسلک پروری اور اپنے مخصوص عقائد و نظریات کی تبلیغ کو ہی اپنا مطمع نظر بنا لیا۔ اس طرح فرقہ پرستی کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اب الا ماشاء اللہ ہمارے علماء و مبلغین نے اس کی آبیاری کو ہی اپنا دینی فریضہ سمجھ لیا ہے۔

منافقانہ فرقہ پرستی کا خاتمہ

منافقانہ فرقہ پرستی کی ماہیت کیا ہے اور اس کے اسباب و محرکات کیا ہیں؟ اس کی وضاحت کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ تعلیم کی روشنی جوں جوں پھیل رہی ہے، یہ حقیقت

روزِ روشن کی طرح آشکار ہو رہی ہے کہ فرقہ پرستی کا ماحول کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات سے ہم آہنگ نہیں، بلکہ یہ تصور جدید ماحول کے پروردہ اور روشن دماغ لوگوں میں مذہب سے نفرت اور بے زاری کا باعث بن رہا ہے۔

مسلمانوں کی ہیت اجتماعیہ اور سرمایہ ملی تفرقہ و انتشار کی زد میں آ کر جس طرح زوال و انحطاط کا شکار ہو چکے ہیں، اس پر ہر درد مند مسلمان ملول اور دل گرفتہ ہے۔

فرقہ پرستانہ تقریروں کا ماحول

جدید تعلیم سے بے بہرہ، نیم خواندہ لوگوں کے لئے فرقہ پرستانہ تقریریں آج بھی وقتی انبساط اور لطف اندوزی کا سامان فراہم کر رہی ہیں۔ لیکن جب ان تقریروں کا طلسم ٹوٹتا ہے اور لوگ ٹھنڈے دل سے غور کرتے ہیں تو ڈیڑھ دو گھنٹہ کی تقریر محض سعی لا حاصل اور تضیع اوقات دکھائی دینے لگتی ہے۔ ان تقریروں سے اسلام کی کون سی خدمت بجا لائی گئی اور ملت اسلامیہ کی ترقی اور ارتقاء کی کون سی راہیں کھلیں؟ یہ سوالات ذرا سے غور و فکر کے نتیجے میں انسانی ذہن میں انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ کیونکہ نوجوان نسل فرقہ پرستی کے چنگل سے آزاد ہونا چاہتی ہے۔ لیکن وہ لوگ جن کے قلب و ذہن فرقہ پرستانہ میلانات کی غلاظتوں سے آلودہ ہیں اور جن کو ذاتی یا گروہی مفادات دین اسلام سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں، وہ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد بھی ایک ایسی ڈگر کو اپنا لیتے ہیں، جو پہلے سے کہیں زیادہ بدتر فرقہ پرستی پر منتج ہوتی ہے۔ ایسے نام نہاد علماء اور سکالر قدیم طرز کی مولویت سے ظاہراً نہ صرف بیزار دکھائی دیتے ہیں، بلکہ وہ ان سب کو بلا تخصیص گردن زدنی قرار دے کر روشن خیالی اور آزادروی (Liberalism) یا مذہبی رواداری کے نام پر اسلام کی ایسی زہر آلود تشریح و تعبیر کرنے لگتے ہیں، جس سے فرقہ پرستی سے بیزار مسلم نوجوانوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسایا جا سکے۔ یہ نام نہاد اتحاد امت کے علمبردار فرقہ پرستی کی اعلانیہ مذمت کرنے

اور خود کو اس سے ماوراء قرار دینے کے بعد نوجوان نسل کے ذہنوں میں ایسا زہر انڈیلتے ہیں، جس کے اثرات فرقہ پرستی سے کہیں زیادہ ضرررساں ہوتے ہیں۔ یہ نام نہاد مبلغین دوسرے مسالک و مکاتب فکر کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ اصلاح کے نام پر ایسی تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں جس کی فرقہ پرستی ایک ایسے روپ میں ظاہر ہونے لگتی ہے جس کی بنیاد سب مسالک و مکاتب فکر اور عقائد و نظریات کی نفی ہوتی ہے اور نتیجتاً ایک نیا مکتب فکر وجود میں آ جاتا ہے۔

اصلاح کے پردے میں فساد انگیزی

متذکرہ بالا آیہ کریمہ میں ایسے افراد (منافقین) کی نشاندہی کی گئی ہے، جنہوں نے اسلام ہی کا نام لے کر تفرقہ اور فساد انگیزی کو اپنا شعارِ حیات بنالیا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس شرانگیزی سے باز آ جائیں تو وہ مصلحین کا لبادہ اوڑھ کر اپنے آپ کو امت مسلمہ کا ہمدرد اور بہی خواہ ظاہر کرنے لگتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے عمل سے بدترین قسم کے شر اور فساد انگیزی کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔

قرآن ''اَلاَ اِنَّھُمْ ھُمُ الْمُفْسِدُوْنَ'' کہہ کر خبردار کرتا ہے کہ ان کی ریشہ دوانیوں اور حیلہ سازیوں سے ہوشیار رہو اور ان کے دامِ تزویر میں نہ آؤ کہ وہ اصلاح کے نام پر فتنہ وفساد کی آگ بھڑکانے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔

نام نہاد مصلحین کے نئے تزویراتی حربے

اسلامی تعلیمات سے والہانہ وابستگی رکھنے والا نوجوان مسلمان جب اپنے گرد و پیش فرقہ پرستی کی دیواریں کھڑی دیکھتا ہے تو وہ اسلام سے ہی بیزار ہونے لگتا ہے اور بالآخر ان نام نہاد مصلحین کے ہتھے چڑھ جاتا ہے، جو ہر مسلک اور مکتب فکر کے خلاف زہر اگلتے ہیں اور فرقہ پرستی یا منافرت کی تردید کے نام پر اسے اسلام کی بنیادی تعلیمات سے ہی بیگانہ بنا ڈالتے ہیں۔ وہ اپنے

زعم میں اسلام کی خدمت کر رہے ہوتے ہیں اور انتہا پسندی کے جوش میں اپنے سوا ہر ایک کو اسلام دشمن، کافر، ملحد، لادین اور مشرک قرار دیتے ہیں، لیکن خود عملاً فتنہ انگیزی کے مرتکب ہو رہے ہوتے ہیں۔ نوجوان نسل کے کچے ذہنوں میں انتشار کا بیج بو کر گمراہی کا پرچار کرتے ہیں۔ یہ عقلیت پرست زعماء کالجوں، یونیورسٹیوں، دفتروں اور جدید تعلیمی اداروں کی آغوش میں پلنے والے نوجوانوں کو بالخصوص اپنا شکار بنا لیتے ہیں، اسلام کی بنیادی قدروں سے نا آشنا نوجوانوں کو بالخصوص اپنا شکار بنا لیتے ہیں۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے نا آشنا نوجوان مسلمان ان کے تزویراتی حربوں کے سامنے بڑی آسانی سے سپر ڈال دیتا ہے۔ ان کا اسلوب اور طریق کار وہی ہے جس کی طرف قرآن اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ اٰمِنُوۡا كَمَاۤ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوۡۤا اَنُؤۡمِنُ كَمَاۤ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ

(البقرہ، ۲:۱۳)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ (تم بھی) ایمان لاؤ جیسے (دوسرے) لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں کہ کیا ہم بھی (اسی طرح) ایمان لائیں جس طرح (وہ) بیوقوف ایمان لائے۔

عہد رسالت مآب ﷺ میں منافقین انہیں تزویراتی حربوں سے کام لے کر مسلمانوں کو بہکانے اور راہ راست سے گمراہ کرنے کے درپے رہتے تھے۔ آج کے نام نہاد مصلحین کا یہ گروہ بھی اسی روش پر چل کر مسلمانوں کی گمراہی کیلئے وہی دام فریب پھیلا رہا ہے، جو عہد نبوی ﷺ میں منافقین مدینہ کا شعار تھا۔ یہ اپنے آپ کو اصلاح کنندہ کہتے ہیں درحقیقت ان کو اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات عزیز ہوتے ہیں۔ یہ مذہبی لبادہ اوڑھ کر مذہب کے نام پر بڑی بڑی اجارہ داریاں قائم کر لیتے ہیں اور اپنے سوا دوسرے مسلمانوں کو جاھل، بے وقوف اور بے عقل کہتے ہیں اور فرقہ پرستی کی مذمت کرتے نہیں تھکتے، لیکن درحقیقت وہ خود فسادی اور فرقہ پرست ہوتے ہیں۔

وہ اپنے انتہاء پسندانہ فکر و عمل سے ایسے نئے فرقوں کی بنیاد رکھ دیتے ہیں، جن سے امت مسلمہ کی وحدت شدید قسم کے انتشار اور بے یقینی کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ بقول حکیم الامت علامہ اقبالؒ:

قومے بمیر داز بے یقینی

کا مصداق بن جاتی ہے۔ یہ لوگ گو اقلیت میں ہیں لیکن اپنے وسائل کے بل بوتے پر وہ اکثریت پر حاوی ہونے کی سعی کرتے ہیں۔ وہ مسلمان معاشرے میں ذہنی آمریت کا تصور اجاگر کرتے ہیں۔قرآن نے اسی ذہنی آمریت کو منافقت سے تعبیر کیا ہے۔

امت کا سواد اعظم گمراہ نہیں ہوتا

رسول پاک ﷺ کا ارشاد ہے کہ میری امت کی اکثریت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوسکتی۔ یہ امت مصطفوی ﷺ کے خصائص میں سے ہے۔ اس کے عقائد، اخلاق اور اعمال میں جزوی بگاڑ واقع ہوسکتا ہے۔لیکن ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ اس کی اکثریت برائی اور گمراہی پر متفق اور مجتمع ہوجائے۔ وہ بے دینی پر مجتمع ہو ہی نہیں سکتی۔ جیسا کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۱۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ۔ تم جماعت کو لازم پکڑو

(جامع الترمذی، ۲:۳۹، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، رقم حدیث: ۲۱۶۵)

۲۔ وَيَدُ اللهِ علَى الْجَمَاعَةِ ۔ اور جماعت پر اللہ (کی حفاظت) کا ہاتھ ہے۔

(جامع الترمذی، ۲:۳۹، کتاب الفتن، ماجاء فی لزوم الجماعة، رقم حدیث: ۲۱۶۷)

اسی حدیث میں مزید ارشاد فرمایا:

۳۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِيْ عَلَى ضَلَالَةٍ۔	بے شک اللہ تعالیٰ میری امت کو گمراہی پر جمع نہیں فرمائے گا۔

(جامع ترمذی، ۲:۳۹، کتاب الفتن، باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ، ۴:۴۶۶، رقم حدیث: ۲۱۶۷)

سواد اعظم کے بارے میں حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

۴۔ عن انس بن مالک يقول سمعت رسول الله ﷺ يقول ان امتى لا تجتمع على ضلالة فاذا رأيتم اختلافا فعليكم بالسواد الاعظم۔	حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میری امت گمراہی پر کبھی جمع نہیں ہو گی جب تم اختلاف دیکھو تو بڑی جماعت کو لازم پکڑ لو۔

(سنن ابن ماجہ، ۲:۳۰۳، کتاب الفتن، باب السواد الاعظم، رقم حدیث: ۳۹۵۰)

حضور اکرم ﷺ کے ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ امت کا اجماع ضلالت و گمراہی پر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس اجماع کا مطلب پوری امت کا کسی کام پر سو فیصد متفق ہونا نہیں۔ کیونکہ یہ تو قطعی طور پر ویسے بھی ناممکن ہے۔ کہ پوری امت بلا اختلاف کسی غلط بات پر متفق ہو جائے۔ اختلاف رائے کا نام منطقی اور قدرتی عمل ہے۔ متذکرہ بالا احادیث مبارکہ کا مقصد درحقیقت اس تصور کو ذہنوں میں جاگزیں کرنا ہے کہ امت مسلمہ کی بھاری اکثریت شر و فساد اور ضلالت و گمراہی پر کبھی مجتمع نہیں ہوسکتی۔ یہی اس امت کی خصوصیت ہے۔ اس تصور کی وضاحت حضور اکرم ﷺ کی حدیث صحیح سے ہو جاتی ہے۔

عن ابی ذر عن النبیؐ انه قال اثنان خیر من واحد و ثلاث خیر من اثنین واربعة خیر من ثلاثه فعلیکم بالجماعة فان الله عزوجل لن یجمع امتی لا علی هدی۔

(مسند احمد بن حنبل، ۵:۱۴۵)

حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ حضور اکرمؐ نے فرمایا کسی مسئلے پر دو افراد کا ایک کے مقابلے میں جمع ہونا محفوظ تر ہے اور اسی طرح چار تین کے مقابلے میں بہتر ہیں، پس تم پر اکثریتی جماعت کی پیروی لازم ہے، کیونکہ اللہ رب العزت میری امت کو سوائے ہدایت کے کسی غلط بات پر جمع نہیں ہونے دے گا۔

فرمودہ رسول ﷺ ''**علیکم بالجماعة**'' اس بدیہی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ امت کی جمعیت بہر حال بہتر ہوتی ہے اور اکثریت اقلیت کے مقابلے میں زیادہ محفوظ و مامون ہوتی ہے۔ حضرت ابو جعفرؓ سے حضرت عمرؓ کا ارشاد مروی ہے جس سے حضور ﷺ کے اس ارشاد کی وضاحت ہوتی ہے۔

عن ابی جعفر قال: قال عمر بن الخطابؓ لاصحاب الشوری: تشاوروا فی امرکم؛ فان کان اثنان و اثنان فارجعوا فی الشوری وان کان اربعة واثنان فخذوا صنف الاکثر۔

(۱۔ طبقات ابن سعد، ۳:۶۱)

(۲۔ کنز الاعمال، ۵:۷۳۳، حدیث، ۱۴۲۵۰)

حضرت ابو جعفرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن الخطاب نے اصحاب شوریٰ سے ارشاد فرمایا کہ اپنے امور میں باہمی مشورہ کیا کرو۔ اگر کسی مسئلہ پر تمہری رائے، دو اور دو میں مساوی تقسیم ہو جائے تو پھر اسے شوری میں لے جاؤ۔ اگر رائے کی تقسیم چار اور دو میں ہو جاے تو اکثریتی رائے کو اپنا لو۔

اسلام کی روح شورائیت

اس حدیث مبارکہ کی رو سے ارشاد ہوتا ہے کہ اگر کسی مسئلے پر اختلاف ہو جائے اور لوگ دوگروہوں میں برابر برابر تقسیم ہو جائیں تو پھر آپس میں باہم مشاورت کر لی جائے۔ اسلام میں شورائیت کی یہ روح ہی اصل جمہوریت ہے، جس کو اکثر لوگ غلط فہمی سے مغرب کی طرف سے آیا ہوا تصور خیال کرتے ہیں۔ حالانکہ مغرب کے اقتدار و غلبہ کی تاریخ دو تین سو سال سے زیادہ پرانی نہیں اور اسلام کے وضع کردہ جمہوریت کو چودہ صدیوں سے زائد عرصہ بیت چکا ہے۔ اسلامی اقتدار کی چودہ سو سالہ تاریخ جس میں خلافت راشدہ اور اسکے بعد آنے والے ادوار شامل ہیں، اس امر کی شاہد ہے کہ اکثریت کے جمہوری حق کا ہمیشہ احترام کیا جاتا رہا ہے۔ رسول پاک ﷺ کا یہی عمل رہا ہے، جس پر خلفائے راشدین اور بعد میں آنے والے سنت مصطفوی ﷺ کے متبع حکمران کاربند رہے ہیں۔ اسلام میں مطلق آمریت کا تصور اس کی روح جمہوریت و شورائیت سے متصادم ہے۔ خلفائے راشدین کا بھی یہی عمل رہا ہے کہ وہ ہر اہم فیصلہ اکثریت رائے سے طے کرتے۔ اس سلسلے میں حضرت علیؓ کا ایک ارشاد نہج البلاغہ میں مروی ہے، وہ فرماتے ہیں:

وسیھلک فی صنفان: محب مفرط یذھب به الحب الی غیر لحق و مبغض مفرط یذھب به البغض الی غیر احق وخیر الناس فی حالا السمط الاوسط فالزموه. والزموا السواد الاعظم فان ید الله علی الجماعة و ایاکم والفرقة	میرے بارے میں دوگروہ ہلاکت کا شکار ہونگے پہلا وہ جس نے میرے ساتھ محبت میں غلو کیا اور حق کے راستے سے دور چلا گیا۔ دوسرا وہ جس نے میرے ساتھ بغض میں غلو کیا اور گمراہ ہوا۔ میرے ساتھ محبت میں جو اعتدال اختیار کرے گا۔ وہی سب سے بہت رہے۔ اے لوگو

فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب الامن دعا الی ھذا الشعار فاقتلوہ ولو کان تحت عما متی ھذہ۔

(نہج البلاغہ، ۲:۷۔۸)

تم بھی اسکے ساتھی بن جاؤ اور جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے فرقہ بازی سے باز آؤ، کیونکہ عوام کی اکثریت سے علیحدہ ہونے والا شیطان کا ساتھی ہے، جس طرح ریوڑ سے علیحدہ ہونے والی بکری بھیڑیئے کی نذر ہو جاتی ہے۔ اے لوگو! جو جماعت سے علیحدگی کا طریقہ اختیار کرے اسے قتل کر دو اگرچہ میرے عمامے کے نیچے ہی پناہ لینے والا کیوں نہ ہو۔

علامہ اقبالؒ نے اسی تصور کو یون بیان کیا ہے:

حرز جان کن گفتہ خیر البشر
ہست شیطان از جماعت دورتر

نبی اکرم ﷺ نے اپنی امت سے وعدہ کیا ہے کہ خدا ہمیشہ میری امت کی اکثریت کا ساتھ دے گا اور میری امت کی اکثریت کبھی صراط مستقیم سے نہیں بھٹکے گی۔

قرآن حکیم ان مٹھی بھر لوگوں کی اقلیت کو جو مسلمانوں کی اکثریت کو بے وقوف اور بے عقل گردانتی تھی۔ خود بے وقوف اور بے عقل کہہ رہا ہے۔ ''اَلاَ اِنَّھُمْ ھُمُ السُّفَھَاءُ'' وہ خود راہ حق سے بھٹکے ہوئے اور بے عقل ہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیمات چونکہ ابدالآباد تک نا قابل تغیر ہیں۔ لہذا آج بھی ان کی حقانیت میں ذرہ بھر شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن ان لوگوں کو جو خود کو اصلاح کنندہ کے طور پر پیش کر کے صرف اپنے آپ کو حق وصواب پر قائم اور دوسرے تمام مسلمانوں کو گمراہ لادین اور عقل ودانائی سے عاری قرار دیتے ہیں۔ یہ بات گم کردہ راہ اور بے عقل

کہتا ہے۔

تاریخ اسلام کے شواہد و نظائر

اسلام کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو یہ بات واضح طور پر نظر آئے گی کہ جتنی بھی الحادی تحریکیں، باطل فرقے اور متکبر قیادتیں ابھری ہیں، وہ امت مسلمہ کی اکثریت کو گمراہ اور خود کو حق و راستی کی راہ پر سمجھتے آئے ہیں۔ اس کی ابتداء خلافت راشدہ کے دور آخر سے ہی ہوگئی تھی۔ جب خوارج کا ایک اقلیتی ٹولہ وجود میں آیا، جنہوں نے ان الحکم الا اللہ کا نعرہ بلند کیا (کہ اللہ تعالیٰ کے سوا حق حکمرانی کسی کو حاصل نہیں) انہوں نے حکومت الٰہیہ کی آڑ میں اپنے سوا باقی سب کو مشرک و کافر قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کو بھی کافر و مشرک کہا اس تکفیر کی زد میں صحابہ تابعین اور تبع تابعین آ گئے۔ خارجیوں نے ان اکابر صحابہ کے خلاف بلاتخصیص و امتیاز جنگ کا اعلان کر دیا۔ بالآخر حضرت علیؓ کی شہادت بھی ایسے ہی لوگوں کے ہاتھوں سے ہوئی۔

بعض مبلغین کے ظاہر و باطن کا تضاد اور ارشاد نبویﷺ

نبی آخرالزمان ﷺ نے ایسے لوگوں کے بارے میں پیش گوئی فرما دی تھی کہ وہ نماز، روزہ اور دوسری فرضی اور نفلی عبادات کے پابند ہوں گے۔ بزعم خویش قرآن کے بہت بڑے علمبردار ہوں گے اور وہ قرآن کی حکمرانی کے داعی بھی ہوں گے اور تلوار لے کر جہاد کے لئے ہمہ وقت مستعد اور تیار بھی نظر آئیں گے۔ لیکن ان کا نقطہ نظر یہ ہوگا کہ وہ اپنے سوا باقی سب کو گمراہ کافر و مشرک اور واجب القتل سمجھیں گے۔ دیکھنے والا ان کے نماز روزہ اور نفلی عبادات میں استغراق اور خشوع و خضوع سے دھوکا کھا جائے گا۔ لیکن آقائے نامدار ﷺ کے فرمان کے مطابق وہ دین و ایمان سے اس طرح خارج ہو چکے ہوں گے جیسے شکاری کا تیر شکار کے اندر سے گزر جاتا ہے اور

اس کی نوک پر ایک قطرہ خون بھی قائم نہیں رہتا۔ ان کا ظاہر سرتا پا اسلام لیکن باطن اسلام اور ایمان کے نور سے خالی ہوگا۔ ان کی زبانوں سے شیریں مقالی اور شکر بیانی ٹپکے گی، لیکن ان کے دل بھیڑیئے کی درشتی سے سوا ہوں گے۔ ظاہراً وہ امت کی اصلاح کا دم بھریں گے۔ لیکن اپنے عمل سے وہ اپنے اس دعوے کی نفی کریں گے اور امت میں بدترین نفاق کا بیج بوئیں گے۔ وہ اسلام سے وفاداری کا دم بھر کر اسلا دشمنی کی راہ اختیار کریں گے۔ یہ منافقانہ فرقہ پرستی جس کی نشاندہی مخبر صادق ﷺ نے فرمادی تھی، ہر دور میں موجود رہی ہے۔ آج بھی ایسے لوگ سرگرم عمل ہیں جو بظاہر اسلام کے سب سے بڑے شیدائی اور فرقہ پرستی سے متنفر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ لوگ جدید تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے بعد اسلامی تعلیمات کے بہت بڑے مبلغ بن گئے اور اپنی دانست میں اپنے سوا باقی سب کو جاہل، مشرک اور واجب القتل سمجھنے لگے ہیں۔ ان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ فرقہ پرستی کی مذمت اور اتحاد ملت کے نام پر نوجوانوں کو اس انداز سے تعلیم دیتے ہیں کہ وہ اپنے سوا باقی سب مسلمانوں کو گردن زدنی سمجھنے لگتے ہیں۔

ایک اہم نکتہ

امت مسلمہ کے لئے صریح فرقہ پرستی اتنی نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت نہیں ہوئی جتنی کہ موجودہ منافقانہ فرقہ پرستی ثابت ہورہی ہے۔ اس فرقہ پرستی کے پیرو اور نام نہاد مبلغین بڑے شدومد سے دعوے کرتے ہیں کہ حق وہی ہے جو وہ کہتے ہیں اور ان کے سوا باقی سب دنیا جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں بھٹک رہی ہے۔ سوچیئے اور غور کیجئے کہ اگر ذہنی تعصب اس حد تک پہنچ جائے تو اس فضا میں جنم لینے والی فرقہ پرستی کتنی خطرناک مضمرات کی حامل ہوگی۔ ان فرقہ پرستوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نوجوان کو اپنا ہدف بناتے ہیں اور ان کو اپنے گرد کھینچ کر فرقہ پرستی کی مذمت اور اتحاد ملت کی ضرورت پر اپنا بیان صرف کرتے ہیں۔ لیکن وحدت کے نام

پروہ قوم کے اندر ایسا انتشار پیدا کر دیتے ہیں کہ ملت گروہ در گروہ تقسیم ہو کر اپنی قوت اور توانائی سے محروم ہونے لگتی ہے۔

لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس منافقانہ اور خفیہ فرقہ پرستی کے میلانات کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جائے تا کہ نئی نسل اس غیر محسوس زہر سے اپنے دل و دماغ کو تحفظ فراہم کر سکے۔ یہ کام تبھی ممکن ہے کہ یہ تصور اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے کہ فرقہ پرستی کسی خاص مسلک، مکتب فکر یا کسی مخصوص عنوان کو نہیں کہتے، بلکہ اس سوچ اور زاویہ نگاہ کو کہتے ہیں، جو ہر دوسرے کو غیر مسلم، لادین اور کافر و مشرک بنانے سے عبارت ہو اور جس کے نتیجے میں صرف خود کو حق پر قائم تصور کیا جائے اور باقی تمام مسلمانوں کو گمراہ۔

تمام مکاتب فکر کے نمائندہ علماء پر مشتمل سپریم کونسل کا قیام

ہر نوعیت کی فرقہ پرستی کی قانونی حوصلہ شکنی کے ساتھ ساتھ مختلف فکر کے نمائندہ مسلمہ علماء پر مشتمل ایک کونسل قائم ہونی چاہیے۔ جس میں مشترک طور پر ایک ضابطہ اخلاق طے کیا جائے۔ تا کہ ہر مسلک کے واعظین، مقررین، مبلغین اور علماء و مصنفین اس ضابطہ اخلاق کے دائرہ میں رہ کر دعوت و تبلیغ دین اور اشاعت مسلک کا کام کریں۔ اس ضابطہ اخلاق کے ذریعے اس امر کی ضمانت مہیا کی جائے کہ کوئی شخص کسی مسلک کے خلاف بالواسطہ یا بلاواسطہ کیچڑ نہ اچھال سکے۔ یہ کونسل ایسے اکابر اور ذی اثر علماء پر مشتمل ہو کہ ان کے متعلقہ مسالک کے علماء و مبلغین ان کی ہدایت پر سختی سے عملدرآمد کے پابند ہوں۔ ان علماء کے ذریعے اس امر کی یقین دہانی حاصل کی جائے کہ اس اخلاقی ضابطے کی خلاف ورزی کرنے والا کوئی بھی خطیب، مقرر، مصنف اور مبلغ نہ صرف اپنے اکابر کے سامنے جوابدہ ہوگا، بلکہ اس کے خلاف مسلکی اور تنظیمی سطح پر تادیبی کارروائی بھی کی جائے گی۔ مثلاً اس مسلک سے متعلق کسی بھی مذہبی یا سیاسی تنظیم میں اسے کسی عہدہ پر برقرار

نہ رکھا جائے گا اسکی رکنیت کو معطل کر دیا جائے گا۔ مذہبی اور تنظیمی اجتماعات میں اسے نمائندے کے طور پر شمولیت سے باز رکھا جائے گا اور شہری و تنظیمی سطح پر اسے اس کی مسجد کی خطابت یا متعلقہ ادارے کی نظامت وسربراہی سے علیحدہ کرنے کے لئے اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا۔

ان اقدامات کے پیچھے جب تک اس نوعیت کی موثر اور فیصلہ کن اخلاقی ضمانتیں موجود نہیں ہوں گی، یہ محض نیک تمناؤں اور آرزوؤں کا پلندا ہوگا۔ ایسی سفارشات سے اتحاد امت کی منزل کی طرف ٹھوس پیش رفت نہ ہو سکے گی۔

اس وقت عملاً صورت حال یہ ہے کہ ہر طبقہ ومسلک کے ذمہ دار افراد امت کو انتشار و افتراق کی آگ سے نجات دلانے اور وحدت و یکجہتی کی فضا کو فروغ دینے کے لئے اتحاد واخوت کی بات تو کرتے ہیں، ایسے منصوبوں میں شامل بھی ہوتے ہیں، اخباری بیانات کے ذریعے فرقہ وارانہ رجحانات کی مذمت بھی کرتے ہیں۔ لیکن انہیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی جماعت تنظیم اور مسلک سے تعلق رکھنے والے کون کون سے افراد بالواسطہ فرقہ وارانہ تضادات وفسادات کو ہوا دینے میں ملوث ہیں۔ ان کے زیر اثر کتنے حلقے اپنے مذموم مفادات کی خاطر فرقہ وارانہ کارروائیوں اور سازشوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی بلکہ سرپرستی فرما رہے ہیں اور کس حد تک ان کے دامن اس گھناؤنے جرم کی سیاہی سے داغدار ہیں۔ مگر وہ نہ تو انھیں اس عمل سے روکتے ہیں اور نہ ان کے خلاف جماعتی سطح پر کوئی کارروائی عمل میں لاتے ہیں۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان طبقات نے اپنی ’’واردات‘‘ کے لئے جدا جدا محاذ کھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک کے ذمے ’’قتل‘‘ ہے۔ دوسرے کے ذمے اخبارات میں بیاناتِ مذمت اور تیسرے کے ذمے ’’مصالحت‘‘ ہر ایک کو اس کے منصب اور حیثیت کے مطابق کام سونپا گیا ہوتا ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجانے والے جب تک خود اپنے اندر صدق واخلاص پیدا کر کے اس دجل وفریب اور منافقانہ روش سے باز نہیں آتے اس وقت تک اس لعنت سے نجات بہت مشکل ہے۔

ہنگامی نزاعات کے حل کے لئے سرکاری سطح پر مستقل مصالحتی کمیشن کا قیام

بعض اوقات مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے دو حلقوں میں کسی مسئلے پر ایک ہنگامی نزاع واقعہ ہو جاتا ہے۔ جو مقامی سطح پر باہمی افہام و تفہیم سے حل نہیں ہوسکتا اور یہ نزاع بڑھ کر وسیع پیمانے پر فرقہ وارانہ کشیدگی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے واقعات کے بار بار رونما ہونے سے وحدت و یکجہتی کے مقصد کو خاصا ضعف پہنچتا ہے۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ جب ایسی صورت حال سے امن عامہ کو خطرہ لاحق ہونے لگے تو حکومت مداخلت کر کے مصالحتی کمیشن یا تحقیقاتی ٹریبونل وغیرہ قائم کرتی ہے۔ لیکن نزاع کو نقصان کے واقع ہو جانے کے بعد رفع کرنے سے زیادہ بہتر ہے کہ نقصان کے وقوع سے پہلے اس کا تدارک کر دیا جائے۔

اگر ایسے نزاعات کو نبٹانے کی ذمہ داری کسی ایک غیر جانبدار تحقیقاتی اور مصالحتی کمیشن یا ٹریبونل کے سپرد کر دی گئی ہو، جو اختلاف و نزاع کے پیدا ہوتے ہی معاملے کی مکمل تحقیق کر کے فیصلہ دے اور فی الواقع متاثر ہونیوالے فریق کی دادرسی کرے تو ہنگامی کشیدگیوں کے مزید فروغ پانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔

اگر کسی طبقے کو اپنے مسلکی و مذہبی حقوق کے پامال ہونے کا شکوہ حکومت کے خلاف ہو تو اسکا فیصلہ بھی آزادانہ طور پر اسی عدالت کے ذریعے ہوسکے۔ مذہبی حقوق کی ایسی آزادانہ دادرسی کا سرکاری سطح پر اہتمام مطلوبہ نتائج کا حصول نہ صرف بہت آسان ہو جائے بلکہ بعض بے بنیاد غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہوسکے گا جن کے سبب سے مستقل طور پر باہمی عناد و مخاصمت کی فضا قائم رہتی ہے۔

مذہبی سطح پر منفی اور تخریبی سرگرمیوں کے خلاف عبرتناک تعزیرات کا نفاذ

فرقہ وارانہ تخریبی سرگرمیوں کے ذریعے امت مسلمہ کے شیرازہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنا‘ بلا شک وشبہ فساد فی الارض ہے اور شریعت محمدی ﷺ کسی قیمت پر فساد فی الارض کے جرم پر معافی کی روادار نہیں ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ یَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَاداً اَنْ یُّقَتَّلُوْا اَوْ یُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔

(المائدہ‘ ۵:۳۳)

بیشک جولوگ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد انگیزی کرتے پھرتے ہیں (یعنی مسلمانوں میں خون ریزی، رہزنی اور ڈاکہ زنی وغیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں) ان کی سزا یہی ہے کہ وہ قتل کئے جائیں یا پھانسی دیئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹے جائیں یا (وطن کی) زمین (میں چلنے پھرنے) سے دور (یعنی ملک بدر یا قید) کر دیئے جائیں۔

ہر چند کہ اس آیت کریمہ کا اطلاق عام طور پر ڈاکے پر کیا گیا ہے، لیکن خود قرآن وسنت سے ثابت ہے کہ فساد فی الارض کا حکم کئی اور جرائم پر بھی صادق ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ میں منافقین کی فتنہ پردازیوں کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے:

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَo	اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد بپا نہ کرو، تو کہتے ہیں ہم بھی اصلاح کرنے والے ہیں۔

(البقرہ، ۲:۱۱)

قرآن و حدیث میں جس شد و مد کے ساتھ اسلام میں تفرقہ پروری اور فتنہ پردازی کی مذمت کی گئی ہے، اسے فساد فی الارض تصور نہ کرنے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہوسکتا۔ لہذا اخلاقی جماعتی اور سرکاری سطح پر باوجود تمام تذکیری اور تادیبی کوششوں کے، اگر کوئی شخص اپنی نام نہاد گروہی قیادت چمکانے اور مذموم مفادات کو حاصل کرنے کے لئے امت میں فرقہ وارانہ تخریبی کارروائی کا مرتکب ہوتا ہے تو اسلامی حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ ایسے شخص کو فساد فی الارض کے سنگین جرم کے تحت تعزیری سزا دے۔ جرم کی سنگینی کے پیش نظر قرآن مجید نے چار متبادل سزائیں بیان فرمادی ہیں اور احادیث کے ذریعے بھی بعض دیگر تعزیرات کی نشاندہی ہوتی ہے۔

چنانچہ اس مقصد کے لئے حسب ضرورت سخت سے سخت تر سزا دے کر ایسی تخریبی کاروائیوں کا مکمل استیصال کیا جانا چاہیے۔ مستزاد یہ کہ فرقہ وارانہ تخریبی کاروائیاں صریحاً ”فتنہ“ کے ذیل میں بھی آتی ہیں۔ جسے قرآن قتل سے شدید تر جرم قرار دیتا ہے۔

الغرض ایسی تخریبی کاروائیاں، مذہب کے نام پر کی جاتی ہیں مگر واضح ہو کہ ان کے خلاف ایسے تعزیراتی اقدامات سے مذہب کا تقدس قطعاً پامال نہیں ہوگا۔ کیونکہ جب کسی نام نہاد ”مذہبی عمل“، ہی تصور نہیں کرتا بلکہ دین و مذہب کے خلاف ایک منافقانہ سازش سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن شاہد ہے کہ منافقین مدینہ نے ”مسجد“ کے نام پر ایک مذہبی مرکز اور عبادت گاہ تعمیر کی تھی۔ چونکہ اس کا مقصد مسلمان میں تفرقہ پیدا کرنا اور اسلام کے استحکام کو نقصان پہنچانا تھا اس لئے نبی

اکرم کو نہ صرف اس میں نماز ادا کرنے سے منع فرمایا گیا بلکہ اسے مسمار کر کے جلا دینے کا حکم صادر ہوا اور نتیجتاً ایسے ہی کیا گیا ارشاد باری ملاحظہ ہو:

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِداً ضِرَاراً وَّ کُفْراً وَّ تَفْرِیْقًا بَیْنَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ اِرْصَاداً لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰہُ وَ رَسُوْلَہٗ مِنْ قَبْلُ ، وَلَیَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَا اِلَّا الْحُسْنٰی ط وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّھُمْ لَکٰذِبُوْنَ O لَا تَقُمْ فِیْہِ اَبَداً ط

(توبہ ۹:۱۰۷)

اور (منافقین میں سے وہ بھی ہیں) جنہوں نے ایک مسجد تیار کی ہے (مسلمانوں کو) نقصان پہنچانے اور کفر (کو تقویت دینے) اور اہل ایمان کے درمیان تفرقہ پیدا کرنے اور اس شخص کے لئے گھات کی جگہ بنانے کی غرض سے جو اللہ اور اس کے رسول سے پہلے ہی جنگ کر رہا ہے اور وہ ضرور قسمیں کھائیں گے کہ ہم نے (اس مسجد کے بنانے سے) سوائے بھلائی کے اور کوئی ارادہ نہیں کیا اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ یقیناً جھوٹے ہیں۔ (اے حبیب ﷺ) آپ اس (مسجد کے نام پر بنائی گئی عمارت) میں کبھی بھی کھڑے نہ ہوں۔

جس طرح اس مسجد کا مسمار کیا جانا، کسی اسلامی شعار کی بے حرمتی کا سبب نہیں بنا اسی طرح تفرقہ پرست اور تخریب کار افراد کے خلاف تعزیری کارروائی قطعاً علماء اسلام کے تقدس کے خلاف تصور نہیں ہو سکتی۔ اسلام کی حرمت، دین کا استحکام اور امت کی وحدت و یکجہتی ہر شخص کی ذاتی عزت سے زیادہ عزیز ہے۔ علماء اسی وقت تک دین کی عزت و حرمت کا سبب اور علامت رہتے

ہیں۔ جب تک وہ دین کی عزت وحرمت کے لیے مصروف کار رہیں۔ اگر وہ خود اپنے قول وعمل کے تضاد، منافرانہ روش اور مناقشانہ مساعی کے باعث امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے لگیں تو وہ ہرگز حرمت دین کی علامت تصور نہیں ہو سکتے۔ پھر ان کی حیثیت مجرمانہ ہو جاتی ہے اور ایسے اشخاص کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی درج ذیل حدیث سے واضح رہنمائی ملتی ہے۔

عن انسؓ بن مالک ان رسول اللہ ﷺ قال رایت لیلة اسری بی رجالا تقرض شفاھھم بمقاریض من نار، قلت: من ھولاء یا جبرئیل قال: ھولاء خطباء من امتک یا مرون الناس بالبرو ینسون انفسھم (فی روایه) الذین یقولون ما یفعلون و یقرؤن کتاب اللہ ولا یعلمون۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے شب معراج کچھ لوگوں کو دیکھا جن کی زبانیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جا رہی تھیں۔ میں نے جبرئیل امین سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ انھوں نے جواب دیا یہ آپ کی امت کے وہ خطباء اور واعظین ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہیں مگر اپنے آپ کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

(شرح السنہ، ۱۴:۳۵۳، رقم حدیث:۴۱۵۹)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں برسبیل تذکرہ ہم ایک ایسی غلط فہمی کا ازالہ کر دینا ضروری سمجھتے ہیں جو حضور ﷺ کے ایک ارشاد کی نسبت بعض لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہے۔ حضور کا فرمان ہے۔

اختلاف امتی رحمة۔

میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔

(کنز العمال، ۱۰:۱۳۶، رقم حدیث:۲۸۶۸۶)

اس فرمودہ رسول کی حکمت و فلسفہ پر روشنی ڈالنے سے پہلے ایک بنیادی اصول ذہن نشین رہے کہ علمی مسائل میں اختلاف بیدار مغزی، صحت مند اور توانا سوچ کی علامت ہوا کرتا ہے۔ علمی اختلاف کی اہمیت کو ایک تمثیل سے واضح طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ بیس تیس طلباء کی ایک جماعت کو حل کرنے کے لئے ایک ایسا پرچہ تھما دیا جائے جو حسابی نوعیت کا نہ ہو۔ بلکہ غور و خوض اور سوچ بچار کا متقاضی ہو۔ اگر تمام لڑکوں کے پرچے کو حل (Solve) کرنے پر سب کا ایک سا جواب آئے اور کہیں کوئی اختلاف نظر نہ آئے۔ تو یہ یکسانیت اس امر کی غماز ہوگی کہ پرچے کو حل کرنے میں نقل چلی ہے اور اپنی عقل کو استعمال کرنے کو توفیق کسی کو نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس اگر مختلف جوابات سامنے آئیں تو یہ اختلاف اس امر کی نشان دہی ہوگا کہ طلبا نے محنت اور ذوق و شوق سے پڑھا ہے اور وہ اپنی تمام تر دماغی صلاحیتوں کو بروئے کار لائے ہیں۔ ثابت ہوا کہ علم و کفر کا باہمی اختلاف اور تنوع بہتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ اور متحرک سوچ کو نیا رخ عطا کرتا ہے۔

حضور ﷺ کا مذکورہ ارشاد اسی حکمت پر دلالت کرتا ہے۔ علمی اختلاف کے دروازے بند کر دینے سے سوچ میں جمود اور تعطل واقع ہو جاتا ہے۔ جس سے معاشرے کا ارتقائی عمل رک جاتا ہے اور زندگی کی جدوجہد میں ترقی اور پیش رفت کے امکانات ختم ہو جاء ہیں۔ آج کی دنیا میں علوم و فنون میں محیر العقول ترقی علمی و فکری اختلاف کی مرہون منت ہے۔ بلکہ ہر فن اور علم کا ارتقاء ہمیشہ تحقیق اور اجتہادی اختلاف در اختلاف ہی پر منحصر ہوتا ہے۔

اختلاف و افتراق میں فرق

امت کا اختلاف اس وقت تک رحمت ہے جب تک یہ علمی حلقوں اور علماء کے دائروں میں محدود رہے لیکن جب یہ اختلاف علمی اجتہاد وارتقاء کی بجائے سیاسی مقاصد، منفعت براری اور حصول جاہ منزلت کے لئے استعمال ہونے لگے۔ تو پھر یہ اختلاف باعث رحمت و ثواب نہیں بلکہ

باعث زحمت و عذاب بن جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں امت مسلمہ کی وحدت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ہر شخص کوچہ و بازار میں اختلافی مسائل کو ہوا دینے لگتا ہے اور فروعات میں الجھ کر ہمہ وقت ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو کر مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ اس ماحول میں اختلافات دشمنی کا روپ دھار لیتے ہیں اور مسلمان مسلمان کے خون کا پیاسا بن جاتا ہے۔ باہمی محبت و مودت کے تمام رشتے ٹوٹ جاتے ہیں اور مسلمان ہو کر بھی ایک دوسرے کو کافروں سے بدتر سمجھنے لگتے ہیں۔

مثبت اسلوب بیان سے اختلاف رحمت رہتا ہے مگر منفی اسلوب بیان اسی کو زحمت بنا دیتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت ایک سادہ سی ہے ایک گلاس تہائی پانی سے بھرا ہوا ہے۔ آپ اس بات کو بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ گلاس کا ایک تہائی حصہ پائی سے بھرہوا ہے یا یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ گلاس کا دو تہائی حصہ پانی سے خالی ہے دونوں طرح بات ایک ہی ہوگی۔ پہلا انداز مثبت اور دوسرا منفی ہوگا۔ مثبت انداز میں اچھائی اور خوبی اور منفی انداز میں نقص اور کمی کا ذکر ہوگا۔

دینی تبلیغ و دعوت میں تنقیدی اور منفی انداز اختیار کرنے کی بجائے تحقیقی، علمی اور مثبت انداز اپنانا ہمیشہ سود مند اور بہتر نتائج پیدا کرنے کا موجب ہوا کسی کی دلآزاری نہیں ہوگی اور ہر مکتب فکر کا آدمی بڑے سکون اور دل جمعی سے آپ کی بات کو سنے گا اور اس سے استفادہ کرے گا۔

مذہبی زندگی میں موجود اختلافات و مناقشات کا ازالہ اس طرح بھی ہوسکتا ہے کہ ہر مسلک کے ذمہ دار اصحاب اختلافی مسائل کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے دوسرے مسلک کو بے جا طعن و تشنیع، عیب بینی اور نکتہ چینی کا نشانہ نہ بنائیں۔ کسی کو کافر، مشرک، بدعتی اور گستاخ جیسے القاب سے نہ نوازیں بلکہ قرآن وسنت کی روشنی میں مثبت انداز سے اپنے مسلک کو بیان کریں۔ اپنے مسلک کی تعریف و تحسین میں جو چاہیں کہیں لیکن دوسروں کو تنقیص و تذلیل سے باز رہیں۔ اگر ہم نے اس طرز عمل کو اپنالیا تو علمی استدلال اور عقیدے کی پختگی کی بنا پر جدوجہد بقاء کی دوڑ میں

صرف وہی مسلک زندہ رہے گا جو قوی اور مضبوط ہوگا اور دوسرا از خود اپنے فطری انجام سے دوچار ہوجائے گا۔ اس طرح صحیح مسابقت (Competition) کی فضا پیدا ہوگی اور ماحول منافرت سے پاک ہوکر ملی اتحاد کا پیش خمیہ بن جائے گا۔

ایک اہم غور طلب پہلو

بہ نظر غائر تاریخ کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ سارے مسلکی اختلافات جن پر آج ایک دوسرے کو گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے برصغیر کی تاریخ میں گزشتہ ۱۰۰ سال سے زیادہ پرانے نہیں۔ اس دور سے پہلے کے سب بزرگ (مثلاً حضرت مجدد الف ثانیؒ، شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شیخ احمد ملا جیون انبیٹھویؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، شاہ عبدالعزیز دیلویؒ، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، وغیرھم) جن کی علمی وجاہت کے سامنے ہم سب کی نگاہیں فرط عقیدت سے جھک جاتی ہیں اور جو ہمارے نزدیک مسلمہ طور پر محترم ہیں۔ ان کے اسلوب زندگی اور طریق تبلیغ سے کھلم کھلا انحراف چہ معنی دارد؟ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ حاجی اداد اللہ مہاجر مکیؒ ایسی مامور دینی شخصیات اختلافی دور میں بھی پیدا ہوئیں ہیں جنہوں نے ہر مکتب فکر کے افراد کے دلوں میں متنازعہ فیہ مسائل کی گھتیاں سلجھانے کے لئے کتابیں لکھیں۔ فارمولے وضع کئے (کم از کم مسلک اہل نسبت کے دعویداروں میں ان کے لئے قدر و منزلت کا مقام پایا جاتا ہے) انکی تصانیف آج بھی راہنمائی کے لئے موجود ہیں کوئی چاہے تو مقصد اتحاد کے لئے ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ دین کے معاملہ میں پیٹ کر ترجیح نہ جائے۔ ذاتی اور گروہی مفاد، جاہ پسندی اور منفعت اندوزی کے مقابلے میں دین کی عزت و ناموراور حمیت کو مقدم جانا جائے۔

مزید یہ کہ امت مسلمہ کے موجوہ انتشار و افتراق کو اتحاد و یک جہتی میں بدلنے کیلئے ٹھوس بنیادوں پر واضع کردہ ایک متفقہ ضابطہ اخلاق کا نفاذ (Enforcement) بھی اشد

ضروری ہے۔

حکومت کے لئے غور طلب مسئلہ

اس ضمن میں جو مسئلہ حکومت کے لئے انتہائی غور طلب ہے اس کے دو پہلو ہیں، داخلی اور خارجی۔

ا۔ داخلی پہلو

حکومت کے اندر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر موجود رہے ہیں جو بڑے معصومانہ انداز میں تجاہل عارفانہ کے مرتکب ہوتے ہوئے، فرقہ پرستی کو ہوا دیتے ہیں۔ سرکاری سطح پر ترتیب دیئے جانے والے مختلف النوع دینی وفود، نصابات تعلیم کو ترتیب دینے والی کیمٹیاں، مساجد اوقات، مدارس اور دیگر سرکاری محاکم، کیلئے علم اساتذہ اور خطباء وغیرہ کی تقرریاں اور دیگر بیسیوں معاملات ایسے ہیں جن کے فیصلے نچلی سرکاری سطحوں پر ہوتے ہیں اور انکی تفصیلات حکام بالا کو براہ راست معلوم نہیں ہوتیں۔ ان معاملات میں ہمیشہ کچھ فتنہ پرور ہاتھ یکطرفہ کاروائیوں میں ملوث رہتے ہیں اس طرح جانبدارانہ سرکاری فیصلوں کے نتیجے میں دوسرے مسالک اور مکاتب فکر میں بے چینی اور اضطراب پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یہی اضطراب، فرقہ وارنہ کشیدگی کو ہوا دینے کا بنیادی سبب بنتا ہے۔ لہذا حکومت کی اساسی ذمہ داری ہے کہ وہ ان معاملات میں چشم بصیرت کھولے رکھے اور ایسے افراد کی دسترس سے سرکاری معاملات کو ہمیشہ بالا رکھے۔

۲۔ خارجی پہلو

اس مسئلے کا خارجی پہلو یہ ہے۔ ملک کے بعض مذہبی طبقے اور جماعتیں، تبلیغ واشاعت دین کے نام پر بعض بیرونی ممالک سے بے پناہ سرمایہ حاصل کرتی ہیں اس طرح مخصوص زاویہ نگاہ رکھنے والے بیرونی ممالک اپنے سرمایے کے ذریعے، اسلام، کے نام پر پاکستان میں فرقہ وارانہ

ماحول کو تقویت پہنچانے کا سبب بن رہے ہیں۔ جب حکومت کی عدم مداخلت کی بنا پر بعض مخصوص طبقے، فرقے، تنظیمیں اور مسلک بیرونی سرمایے سے روز بروز سیاسی، تنظیمی افرادی اور نیم فوجی قوت بڑھاتے چلے جائیں اور وقتاً فوقتاً اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہے تو صاف ظاہر ہے کہ اس مخصوص تعلق کے نتیجے میں دیگر طبقات کو اندرون ملک اور بیرون ملک ہر سطح پر نقصان پہنچایا جائے گا۔ یہی وہ ذرائع اور وسائط ہیں جن کی بنا پر مسلمانوں کے مابین وحدت و یگانگت پیدا کرنے کی کوئی کوشش بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی۔

لہذا یہ حکومت کی انتہائی بنیادی اور نازک ذمہ داری ہے کہ تمام طبقات کیلئے کسی بھی نام پر بیرونی سرمایے کا حصول نہ صرف ممنوع اور غیر قانونی قرار دے بلکہ اس کا حصول عملاً ناممکن بنا دے اور متعلقہ حکومتوں سے درخواست کرے کہ اگر وہ خدمت دین کے لئے پاکستان میں سرمایہ کاری کرنا چاہتی ہیں تو بجائے نجی اداروں اور تنظیموں کے خود حکومت کو سرمایہ فراہم کریں تاکہ اسے منصفانہ اور دیانتدارانہ طریق پر تقسیم کیا جا سکے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر حکومت اس مسئلے کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر بھرپور توجہ دے تو کافی حد تک حالت پر قابو پایا جا سکتا ہے۔

صفحہ	حوالہ نمبر	آیات	نمبر شمار
۴۱	۱۰۸:۶	تسبوا الذین یدعون فی دونِ اللہ ...	۱۴
۱۹	۱۵۹:۶	ان الذین فرقوا و ینھم...	۱۵
		اعراف	
۵۳	۱۵۷:۷	و یضع عنھم اصرھم و الا غلل التی ...	۱۶
		انفال	
۱۶	۴۶:۸	فلا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم...	۱۷
		التوبه	
۴۳	۱۰۵:۹	قل اعملوا فسیری اللہ اعملکم...	۱۸
۹۲	۱۰۷:۹	والذین اتخذوا مسجداً و ضراً و کفراً...	۱۹
		النحل	
۴۰	۱۲۵:۱۶	ادع إلی سبیل ربک بالحکمة...	۲۰
		الکھف	
۵۲	۲۹:۱۸	و قل الحق من ربکم فمن شاء فلیؤمن...	۲۱
		بلد	
۵۲	۱۰:۹۰	و ھدینه نجدین۔	۲۲
		الشمس	
۵۲	۸:۹۱	فالھمھا فجورھا و تقوھا۔	۲۳

نمبر شمار	اعلام	صفحہ
۲۰	شاہ ولی اللہؒ	۷۱، ۹۶
۲۱	شہاب الدین سہروردیؒ	۷۱
۲۲	حذیفہؓ بن یمان	۲۰
۲۳	زہریؒ	۴۵
۲۴	راغب اصفہانیؒ	۱۱
۲۵	رومیؒ، مولانا	۷۱، ۶۳
۲۶	عبدالحق محدث دہلویؒ	۷۱، ۹۶
۲۷	عبدالرحمن جامیؒ	۶۳، ۶۴، ۷۱
۲۸	عبدالقادر جیلانیؒ	۷۱
۲۹	عبداللہ بن حزافہ سہمی	۴۴
۳۰	عبداللہ بن عباسؓ	۵۶
۳۱	عبداللہ بن عمرؓ	۲۱
۳۲	عبداللہ بن عمروؓ	۴۱
۳۳	علیؓ	۸۳، ۸۵
۳۴	علی ہجویریؒ	۷۱
۳۵	عمرؓ بن خطابؓ	۸۲
۳۶	غزالیؒ	۷۱
۳۷	فارابی	۶۳
۳۸	فخر الدین رازیؒ	۶۳

کتابیات

کتاب	مصنف/متوفی	مطبوعہ/سن طباعت
تفسیر ابن کثیر	حافظ ابوالفدا عماد الدین ابن کثیرؒ ۷۷۴ھ	بیروت، ادارہ اندلس، ۱۲۷۵ھ
تفسیر خازن	علامہ علی بن محمد خازنؒ، ۷۲۵ھ	پشاور دارلکتب العربیہ
جامع ترمذی	امام ابوعیسی محمد بن عیسی ترمذی ۲۷۹ھ	کراچی، کارخانہ تجارت کتب
سنن ابن ماجہ	امام ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہؒ ۲۷۴ھ	کراچی، کارخانہ تجارت کتب
سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد سلیمان بن اشعثؒ، ۲۷۵ھ	لاہور، مطبع تحقیقاتی، ۱۴۰۵ھ
شرح السنۃ	امام حسین بن مسعود بغویؒ، ۵۱۶ھ	بیروت، مکتبہ اسلامی، ۱۴۰۰ھ
صحیح بخاری	امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاریؒ ۲۵۶ھ	کراچی، نور محمد اصح المطابع، ۱۳۸۱ھ
صحیح مسلم	امام ابوالحسین مسلم بن حجاج قشیریؒ، ۲۶۱ھ	کراچی، نور مطبع اصح المطابع، ۱۳۷۵ھ
القرآن الکریم	منزل من اللہ	
کنزالعمال	علامہ علی متقی بن حسام الدین برہان پوری ۹۷۵	بیروت، موسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۵ھ
مسند احمد بن حنبل	امام احمد بن حنبلؒ، ۲۴۱ھ	بیروت، مکتبہ اسلامیہ، ۱۳۹۸ھ
مشکوٰۃ المصابیح	شیخ ولی الدین تبریزیؒ، ۷۴۲ھ	دہلی، اصح المطابع
المفرادات	راغب اصفہانی، ۵۰۲ھ	ایران المکتبہ المصوفیہ
نہج البلاغہ	(خطبات) حضرت علیؑ	بغداد، دارلکتب العلمیہ۔